چراغوں کا سفر

رام لعل

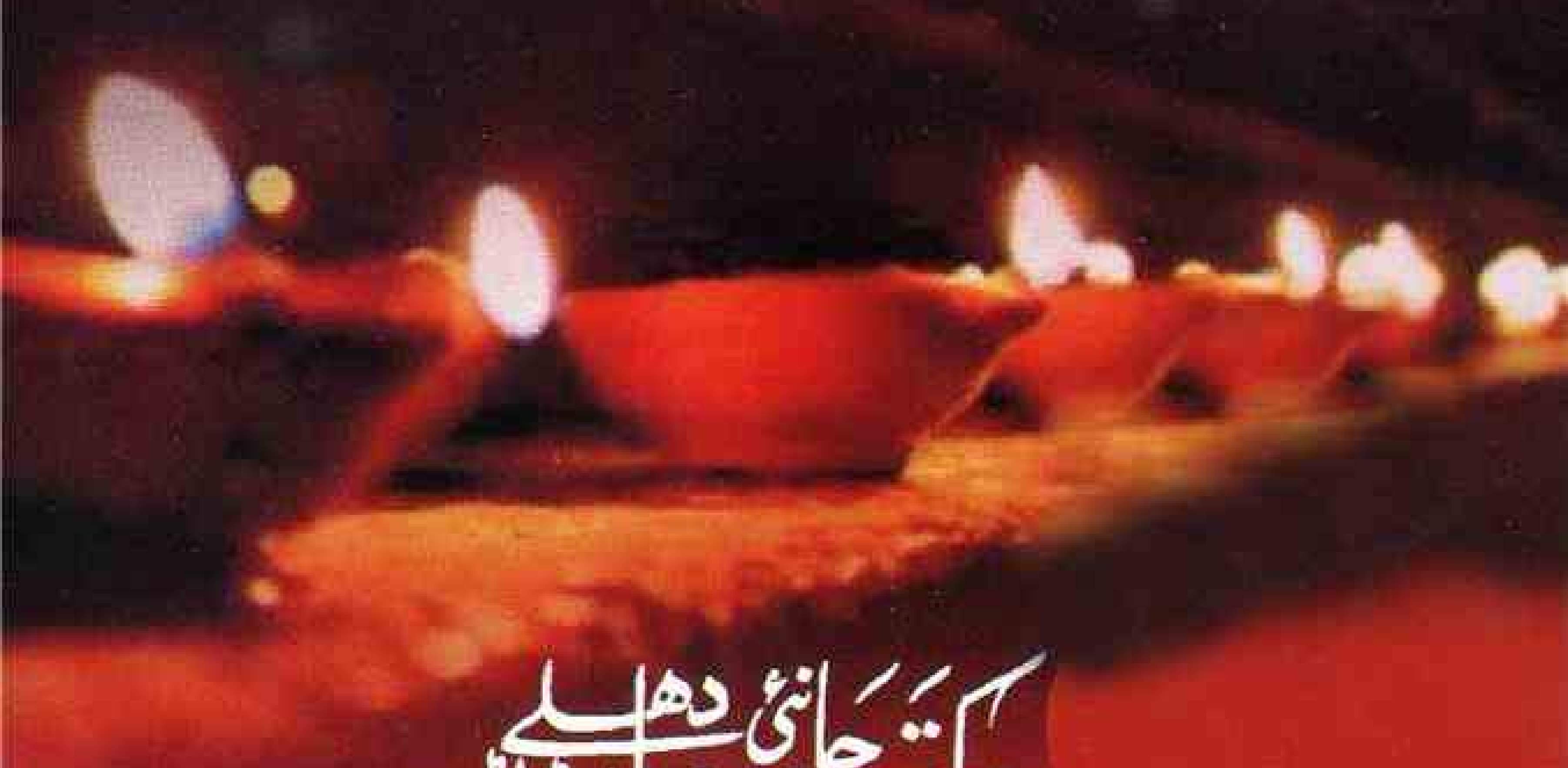

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید
آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں
مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب
کے حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو
جوائن کریں
ایڈمن پینل :
محمد ثاقب ریاض :03447227224
سدرہ طاہر :03340120123
حسنین سیالوی :03056406067
Imagitor

چراغوں کا سفر

HaSnain Sialvi

رام لعل

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

© مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

Charaghaun Ka Safar
by
Ram Lal
Rs.93/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ـ 110025 ☎ 011-26987295
Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ـ 110006 ☎ 011-23260668
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی ـ 400003 ☎ 022-23774857
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ـ 202002 ☎ 0571-2706142
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ـ 110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2013 تعداد: 1100 قیمت: -/93روپے
ISBN:978-81-7587-993-5 سلسلۂ مطبوعات:1753

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی ـ 110025
فون نمبر:49539000 فیکس: 49539099
ای میل:urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد ـ 110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

چند معروضات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جس نے معتبر ادیبوں کی سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور اپنے ماضی کی شان دار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ مکتبہ کے اشاعتی کاموں کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہوگیا تھا جو زمانے کے سرد وگرم سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں۔ نامساعد حالات نے سمت و رفتار میں خلل ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی اور نہ عزم سفر ماند پڑا، چنانچہ اشاعتوں کا تسلسل کلی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مکتبہ نے خلاق ذہنوں کی اہم تصنیفات کے علاوہ طلبا کی نصابی ضرورت کے مطابق درسی کتب بھی شائع کیں اور بچوں کے لیے کم قیمت میں دستیاب ہونے والی دل چسپ اور مفید کتابیں بھی تیار کیں۔ "معیاری سیریز" کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا اور یہی عمل اس کا نصب العین قرار پایا۔ مکتبہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا اور مقبول خاص و عام ہوا۔ آج بھی اہل علم و دانش اور طلبا مکتبہ کی مطبوعات سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ درس گاہوں اور جامعات میں مکتبہ کی مطبوعات کو بہ نظر استحسان دیکھا اور یاد کیا جاتا ہے۔

ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہوگیا تھا جس کے سبب فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جارہی تھیں ان میں سے دو سو ٹائٹل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے شائع ہو چکے ہیں اور ان سے زیادہ قطار میں ہیں (اسی دوران بچوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً سو کتابیں مکتبہ نے بلا شرکت غیرے شائع کی ہیں)۔ زیر نظر کتاب مکتبہ جامعہ اور قومی کونسل کے مشترکہ اشاعتی سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

مکتبہ کے اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور اس کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین محترم جناب نجیب جنگ صاحب (آئی اے ایس) وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جس خصوصی دل چسپی کا مظاہرہ کیا ہے وہ یقیناً لائق ستائش اور ناقابلِ فراموش ہے۔ مکتبہ جامعہ ان کا ممنون احسان رہے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اربابِ حل وعقد کا شکریہ بھی ہم پر لازم ہے جن کے پُرخلوص تعاون کے بغیر یہ اشتراک ممکن نہ تھا۔ اوّلین مطبوعات میں کونسل کے سابق ڈائرکٹر کے تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا جا چکا ہے۔ مکتبہ کی باقی کتابیں کونسل کے موجودہ فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین صاحب کی خصوصی توجہ اور سرگرم عملی تعاون سے شائع ہو رہی ہیں، جس کے لیے ہم ان کے اور کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کے ممنون ہیں اور تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ مکتبہ کو ہمیشہ ان مخلصین کی سرپرستی حاصل رہے گی۔

خالد محمود
مینجنگ ڈائرکٹر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

HaSnain Sialvi

فہرست

پیش لفظ	۹
۱۔ آنگن	۱۱
۲۔ داماد	۲۴
۳۔ رَس رِس	۴۰
۴۔ مائی ڈیر سویتا	۵۳
۵۔ سفر مسلسل	۷۳
۶۔ تمھارے بچّے جیئں	۱۰۰
۷۔ تمھارا فیصلہ کیا ہے؟	۱۰۸
۸۔ تیری گلی میں	۱۳۴

۹۔ دودھ ۱۴۵

۱۰۔ کن کھجورا ۱۵۰

۱۱۔ تصادم ۱۵۷

۱۲۔ آبلہ ۱۶۳

۱۳۔ شیرازہ ۱۷۱

۱۴۔ ساحل ۱۷۸

۱۵ یہ میرا گھر ہے ۱۸۹

۱۶۔ بے سر کا گوتم ۲۰۳

احمد ندیم قاسمی کے نام

آٹھ اور آٹھ

آج میں اپنے کو اُردو افسانے کی دو نسلوں کے درمیان پھنسا ہوا پاتا ہوں ایک نسل پچاس سے اُوپر جا چکی ہے۔ دوسری بیس سے آگے بڑھ آئی ہے۔ اس کیفیت کو میں سینڈوچ کا نام بھی دے سکتا ہوں اور کسی حد تک دو پاٹوں کے بیچ، کے محاورے سے بھی اس کا مفہوم پیش کر سکتا ہوں۔

اردو افسانے کی جو نسل پریم چند کے فوراً بعد آئی تھی ان کی تحریروں کے ذریعے سے میں نے بہت سی پُرانی اور فرسودہ اقدار کے بدلنے اور مٹنے کا المیہ محسوس کیا تھا۔ ان کے خیالات اور افکار آزادی سے قبل کے حالات کے نہ صرف ترجمان ہی تھے بلکہ انھیں بدلنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ میرے شعور کی کافی کچھ تربیت اسی زمانے کے ادب نے کی۔

جب میں نے لکھنا شروع کیا تو میں بالکل تنہا تو نہیں تھا۔ میرے کتنے ہی ہم عمر افسانہ نگار میرے ساتھ یا آگے پیچھے کے مختصر سے عرصے میں لکھنا شروع کر چکے تھے۔ لیکن ان میں سے کسی کے ساتھ ذہنی رقابت کا احساس مجھے نہ ہو سکا۔ ترقی پسند تحریک نے کسی حد تک میرے احساس تنہائی کو کم کرنے میں حصہ لیا لیکن وہ زمانہ میرے لیے بہت ہی مختصر ثابت ہوا۔ بمشکل تین چار سال، اس کے بعد اس تحریک کا تنظیمی شیرازہ بکھر گیا تو میرے لیے پھر وہی سناٹا تھا دور دور تک کسی رفیق کا پتہ نہیں تھا۔ لیکن یہی سناٹا میرے لیے بے حد تخلیقی بھی بنا۔ ۱۹۵۷ء کے بعد میں نے اپنی ذات کی کھائیوں میں گم ہو کر کچھ ایسے افسانے بھی لکھ لیے جن کے ذریعے سے میں خود کو اردو کے چند پڑھے لکھے لوگوں سے بھی روشناس کرا سکا۔ 'ادسی' 'ایک شہری پاکستان کا' "دنیٔ دھرتی

"پُرانے گیت"، "فیر"، "سیوادار"، "روشنی کے آنچل" وغیرہ۔ یہ افسانے میرے "گلی گلی" "نئی دھرتی پُرانے گیت"، "آواز تو پہچانو" وغیرہ مجموعوں میں شامل ہیں۔

۱۹۶۰ء میں مجھے اپنے آس پاس کچھ نئی تبدیلیوں کا احساس ہوا۔ جیسے پُرانی اقدار اب یکسر ختم ہو چکی ہیں۔ جن نئی اقدار کا میں نے سہارا لے رکھا ہے وہ بھی اپنی جگہ سے سرک رہی ہیں۔ نیا ذہن گزشتہ دور کی ہر خوب صورت شے کو مٹاتا اور روندتا ہوا آگے بڑھ آیا ہے۔ اب وہ لوگ اپنا ڈومی نیشن چاہتے ہیں جو مکّاری، خود غرضی اور گالی گلوچ کے علاوہ ہر ایک تسلیم شدہ قدر کی مخالفت کرنا اپنا دھرم سمجھتے ہیں۔

کیا میں نے اپنے اندر کوئی خوف و ہراس محسوس کیا؟ جی چاہتا ہے یہاں تھوڑا سا جھوٹ بول جاؤں۔ میں نے قطعاً کوئی خوف محسوس نہیں کیا۔
..بیچ کی نسل کے حصے میں کوئی ڈومی نیشن آئی ہی نہیں۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک کا زمانہ کسی قسم کی بغاوت کے لیے سازگار ہی نہیں تھا۔ آزادی اور تقسیم ملک کے بہت بڑے ہنگامے کے بعد ایک سناٹا جیسے لازمی امر تھا۔ اس زمانے کا ادب بھی کم اہم نہیں ہو سکتا جو سکون پسند ذہنوں کی برسوں کی گھٹن کا نتیجہ ہے۔ میں نے اس طویل خاموشی میں بھی اپنے لیے راستوں کی تلاش جاری رکھی ہے۔ یہ آٹھ اور آٹھ سولہ افسانے جنھیں میں "چراغوں کا سفر" مجموعے میں پیش کر رہا ہوں۔ میری سینڈوچ ہونے کی کیفیت، کاوش اور جستجو کو پیش کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں، اس بات کا صحیح احساس مجھے میرے قارئین ہی کرا سکتے ہیں۔

۱۲ر اگست ۱۹۶۶ء   رام لعل

آنگن

اُس دن صبح صبح ہی نیتا کے ساتھ کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ جھگڑا ہو جانے کے بعد ایک دوسرے سے کوئی بات کیے بنا ہی ہم نے چائے پی اور اسی طرح چپ رہ کر کھانا بھی کھا لیا تھا۔ ایسا کرتے وقت ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کی بجائے اس آنگن کی طرف خالی آنکھوں سے دیکھتے رہے جس کے سامنے ہی ہم اپنے آنگن کے کونے میں بنے ہوئے ڈائننگ روم میں بیٹھے تھے۔ ایک دیوار، ایک چق اور ایک جنوبی ہند کی سندر چتروں والی چٹائیوں سے بنی اسکرین سے گھری ہوئی جگہ کو اگر ڈائننگ روم کہا جا سکتا ہے تو وہ ——— واقعی ایک ڈائننگ روم تھا۔

ادھر کئی دنوں سے نیتا کے ساتھ جھگڑا رہنے لگا تھا۔ یہ بات بہت عجیب تھی کہ نیتا ایسی سندر پتنی کے ساتھ رہ کر بھی اس گھر میں ناخوشگواری پیدا ہو جاتی تھی۔

اس روز اتوار تھا اتفاق سے کوئی ملنے والا بھی نہیں آ نکلا ورنہ ہم اسی طرح چپ اور ایک دوسرے سے یوں کٹے کٹے سے کیسے رہ سکتے تھے۔

ہاں اس روز صبح صبح ہی تو نیٹا کی ایک جان پہچان کی مسز اگروال آ گئی تھیں۔ یہ آگ انہی کی لگائی ہوئی تو نہیں تھی لیکن اس دن کے جھگڑے کا کارن تو دراصل وہی تھیں۔

نیٹا نے مسز اگروال سے ہمارے اُس مکان کا ایک حصّہ کرائے پر دے دینے کا پرامز کر رکھا تھا۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن مسز اگروال چاہتی تھیں اس آنگن کا پارٹیشن کر کے رہنے کے دونوں حصّے الگ الگ کر دیے جائیں۔ پارٹیشن کرتے وقت دیوار کی دونوں طرف الگ الگ باتھ روم بھی بنا دیے جائیں۔ مکان کی اس طرح کی تبدیلی کے لیے نیٹا مجھے کئی مہینوں سے کہہ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا ایسا کیے بغیر ہمیں کوئی بھی ڈھنگ کا کرائے دار نہیں مل سکے گا۔ صبح اس نے اپنی بات کو پھر دہرایا تو میں نے صاف انکار کر دیا۔ اسے میرا انکار کرنا بُرا لگا۔ بُرا لگنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے مسز اگروال کی موجودگی میں انکار کیا تھا۔ اس سے نیٹا کی سُبکی سی ہوئی تھی۔

مجھے اپنی اس حرکت کا افسوس تھا۔ مجھے اپنی بیوی کے جذبات کا کچھ خیال رکھنا چاہیے تھا۔ اسی کے لیے میں نے اس سے معافی بھی مانگ لی تھی۔ لیکن جو بھی ہو، زخمی جذبات کچھ دیر تک تو ٹیستے ہی ہیں۔ میں تو ابھی تک نیٹا سے خفا تھا۔ وہ آنگن کی دل کشی کو ختم کر دینے کے لیے بار بار ضد کیوں پکڑ لیتی تھی!

میں دراصل روز روز کی چخ چخ سے پریشان ہوا بیٹھا تھا۔ باپ دادا سے وراثت میں ملی ہوئی چھ کمروں والی اس ایک منزلہ عمارت کے بیچوں بیچ بنے اتنے بڑے آنگن کی خوب صورتی کیوں مٹنے دوں؟ اتنا بڑا آنگن تو ہمارے محلّے میں کسی کے پاس نہیں تھا۔ اڑوس پڑوس والوں نے ضرورت پڑنے پر

ہمیشہ اس کا استعمال کیا تھا۔ ہر سال اسی جگہ جمع ہو کر سب لوگ ہولی ملتے تھے۔ جب دسہرے کا تیوہار نزدیک آجاتا تو رام لیلا کمیٹی والے گھر گھر جا کر چندہ مانگنے سے پہلے یہیں آجاتے اور ہنومان، سگریو، نل نیل وغیرہ بندروں کا بھیس بدل کر اُچھلتے کودتے اور کلکارتے ہوئے یہاں سے نکلتے تھے۔ یہ سلسلہ میرے پرکھوں کے سمے سے چلا آرہا تھا۔ اسی وجہ سے محلے والے ان کے نام کا بڑا آدر کرتے تھے۔ اسی سلسلے کو جاری رکھ کر میں نے بھی ویسی ہی عزت پائی تھی۔ ابھی دو تین دن پہلے نیشنل بنک کے پوری جی نے آنگن مجھ سے مانگا تھا۔ ایک ہفتے بعد ان کی بیٹی پونی کا بیاہ تھا۔ کچھ ایک اوروں نے بھی آگے پیچھے کی تاریخوں میں یہ جگہ اپنے لیے چاہی تھی۔

نیٹا نے میری سماجی اہمیت کے اس پہلو پر غور کیوں نہیں کیا؟ وہ مجھے بار بار یہ طعنہ کیوں دینے لگتی ہے آپ کو تو بس لوگوں کا ہی سدبھاؤ چاہیے اپنی مالی حالت سدھارنے کی تو کوئی چنتا ہی نہیں ہے۔ اس کا بس چلتا تو مجھے اور خود کو کسی کونے میں سمیٹ کر باقی سارا مکان ہی کرائے پر اٹھا دیتی!

مجھے اس کی ضد بہت عجیب سی لگی۔ خوب صورت عورتیں عام طور پر ضدی ہی ہوا کرتی ہیں۔ وہ مرد کی محبت سے فائدہ اُٹھا کر اپنی ہر بات منوانے پر تل جاتی ہیں۔ نیٹا نے اس گھر میں قدم دھرتے ہی پہلے اس آنگن کا جائزہ لے ڈالا تھا۔ پھر ایک عجیب سی خوشی سے مغلوب ہو کر کہہ اٹھی تھی۔

"ہائے یہ تو بہت بڑا آنگن ہے۔ اتنے بڑے آنگن پر تو دو مکان اور کھڑے ہو سکتے ہیں!"

پھر ایک روز اس نے میرے پہلو میں بیٹھ کر روایتی بیویوں والے انداز میں بڑے لاڈ سے یہ پلان بنایا تھا ——— سارے مکان کو ہی ہم گروا دیں گے ۔ اتنے بڑے آنگن کی بھی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ۔ یہاں ہم تین منزلہ مکان بنوائیں گے ۔ ہر منزل پر تین تین فلیٹ ۔ ایک ایک فلیٹ کا کرایہ تین تین سو تو مل ہی جائے گا ۔ آپ چاہیں تو اس کام کے لیے میرے سارے گہنے حاضر ہیں ۔ مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ۔ میری تین سو ہر مہینے کی تنخواہ بھی آپ لے لیا کیجیے ۔ صرف آپ کی تنخواہ میں ہی گھر کا سارا خرچ چلا لیا کروں گی ۔ آپ کا بنک بیلنس اور پراویڈنٹ فنڈ اور ——— زیادہ ضرورت پڑی تو ہم اِدھر اُدھر سے قرض بھی لے لیں گے ۔ مکان بنتے ہی ہم سارا قرض دو تین سال کے اندر اندر نپٹا دیں گے “

سالئے مکان کو گروا کر ایک نیا مکان بنانے کا منصوبہ تو ابھی دو سال بعد ہی شروع کیا جا سکتا تھا ۔ جب میری اور اس کی تنخواہ میں سو اور پچاس کی ترقی ہونے والی تھی لیکن ابھی تو وہ دو سو روپے ہر مہینے حاصل کرنے کے لیے اس آنگن کی تقسیم چاہتی تھی ۔

اس دن شام تک ہمارا میل نہ ہو سکا ۔ الگ الگ ہی کمروں میں ہم پڑے رہے ۔ میں صوفے پر لیٹا ایک ناول پڑھتا رہا ۔ پتہ نہیں وہ کیا کرتی رہی ؟ میں نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی ۔ صبح کو اس کے ہاتھ میں امتحانوں کی کاپیوں کا بنڈل تھا ۔

جہاں میں لیٹا تھا وہاں سے آنگن صاف دکھائی دیتا تھا ۔ نومبر کے شروع کی دھوپ وہاں اُتری ہوئی تھی ۔ سنہری اور گُن گُنی دھوپ جسے آنکھیں بند کرکے شریر میں جذب کر لینے کی خواہش ہوا کرتی ہے ۔ ہلکی ہلکی

ہوا بھی چل رہی تھی جو دیوار پر چڑھی بیلوں اور پیڑوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر، ان کے پیلے سوکھے پتّے گرا کر سارے آنگن میں ہی اِدھر سے اُدھر اڑاتی پھرتی تھی۔ میں نے کچھ دیر کے لیے ناول اپنی چھاتی پر اُلٹا رکھ دیا۔ گردن گھما کر آنگن کی دل کشی میں کھو گیا۔

کئی سال پہلے، جب میں کچھ ہی سال کا رہا ہوں گا میں نے یہاں پہلی بار ایک بارات کا سواگت ہوتے دیکھا تھا۔ باراتی ڈھول اور باجوں کے ساتھ ناچتے گاتے ہوئے آئے تھے۔ میں اپنے ہم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ چھت کی منڈیر پر بیٹھا خوش ہو رہا تھا۔ ہم لوگ تالیاں بھی بجاتے رہے تھے۔ منڈیر کے کنارے پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے کنکر بھی نیچے گراتے رہے تھے۔ جب کوئی کنکر کسی باراتی کے سر پر جا پڑتا اور وہ سر اٹھا کر ہمیں گھورنے لگتا تو ہم ڈر کر مگر ہنستے ہوئے بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ اسی دن میں نے پہلی بار بندوق دیکھی تھی جب ایک باراتی نے جوش میں آ کر سب کے منع کرنے کے باوجود اپنی دو نال کی بندوق سے دو ہوائی فائر داغ دیے تھے۔ ڈز ڈز کی اونچی آواز سن کر ہم سب نے کانوں میں انگلیاں دے لی تھیں۔ ساری باتیں تو مجھے یاد نہیں ہیں لیکن کچھ دھندلی سی تصویریں اب بھی کبھی کبھی سامنے کھڑی ہوتی ہیں۔

مجھے اپنی بوا کا بیاہ بھی یاد ہے۔ تب بھی میں چھوٹا سا ہی تھا۔ جب وہ اپنے دولھا کے ساتھ جانے لگی تھی تو وہ اس گھر کے ایک ایک آدمی کے ساتھ گلے لگ لگ کر روئی تھی۔ مجھے اس کا چیخیں مار اٹھنا ابھی تک یاد ہے۔ مجھے بھی وہ اپنی باہوں میں سمیٹ کر روتے روتے پتہ نہیں کیا کیا کہتی رہی تھی۔ اس سے مجھے بے حد لگاؤ تھا۔ وہ بھی مجھے بہت چاہتی تھی۔ مجھے روز پیسے دیا کرتی تھی۔ میرا اس کے

لیے دو بار ایک فوجی کے خط بھی لے آیا تھا۔ جنھیں اس نے سب سے چھپ کر مگر آنکھوں میں آنسو لا لا کر پڑھا تھا۔ ایک بار اس نے میرے سامنے آنگن میں دروازے کی آڑ میں کھڑے ہو کر اس فوجی کے ساتھ کچھ باتیں بھی کی تھیں ۔ فوجی اس دن کہیں بہت دور چلا گیا تھا۔ اور شاید پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ میری بوا اب ادھیڑ ہو چکی ہے۔ اب بال بچوں والی ہے۔ پتہ نہیں اُسے یہ سب یاد ہے یا نہیں ۔ اس نے مجھ سے کبھی کچھ نہیں کہا۔ میں بھی اس سے کچھ نہیں پوچھ سکا۔

پھر ایسا ہوا کہ میں عمر میں کچھ بڑا ہو گیا۔ کچھ جسمانی ساخت بھی بڑھی ۔ تب شاید میں ہائی اسکول میں تھا۔ اڑوس پڑوس کی دو ایک لڑکیاں جو عمر میں مجھ سے ایک ایک دو دو سال بڑی تھیں لیکن میرے ساتھ ہی کھیلا کرتی تھیں ان کے بیاہ بھی اسی آنگن میں ہوتے۔ وہ بھی یہاں سے روتی ہوئی وداع ہوئیں۔ انھیں روتا دیکھ کر ہم لوگ بھی کسی قدر افسردہ ہو اٹھتے تھے۔ مگر اس کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اس زمانے کا ایک دلچسپ واقعہ بھی مجھے یاد ہے۔ یہاں دسہرے کے دنوں میں رام اور ہنومان کی لڑائی ہو گئی۔ ہنومان نے کسی بات پر طیش میں آ کر رام کو اٹھا کر دے مارا۔ رام کو بہت چوٹیں آئیں۔ کئی دنوں کی کوشش کے کہیں جا کر اسی جگہ بھگت اور بھگوان کی آپس میں صلح کرائی جا سکی تھی۔

یہ واقعہ یاد آتے ہی میں مسکرا اُٹھا۔ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں سے نکل کر آنگن کے بیچ کھڑے ہو کر ایک اور دلچسپ واقعہ بھی یاد آیا، ہماری گلی میں ایک لڑکی دلاری بھی رہتی تھی۔ بانس کی طرح لمبی اور پتلی۔ کوئی لڑکی ذرا سی لمبی نکل جائے تو وہ بہت عجیب سی لگتی ہے۔ ہم اسے بانس دیدی کہہ کر چڑاتے تھے۔ ہمیں وہ پکڑ لیتی تو ہماری ٹھکائی بھی خوب کر دیتی۔ ہم اس کے منہ پر ہی کہا کرتے ــــ بانس دیدی تیرا بیاہ کبھی نہیں ہوگا!' لیکن ایک دن اسی آنگن میں اسے بھی بیاہ لے جانے کے لیے ایک دولھا بارات لے کر آ گیا۔ جس روز وہ

ڈولی میں لے جائی جارہی تھی ہم سب لڑکے دیوار کے سہارے کھڑی ہوئی اپنی سائیکلوں کی گدیوں اور کیریئر پر بیٹھے اس کی طرف بڑی اداس نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اس سمے بھی بانس کی مانند لمبی لگ رہی تھی۔ اپنے نئے نویلے سے دوپورا ڈپی! لیکن ہم لوگ ہنسنے یا مذاق اڑانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ اسے رونا سسکتا دیکھ کر ہماری آنکھیں بھی بھیگ چلی تھیں۔

دلاری کے بیاہ کے بعد اس محلے کی کچھ اور لڑکیوں کے بیاہ بھی آگے پیچھے کی تاریخوں میں کر دیے گئے تھے۔ پتہ نہیں کیا سبب تھا؟ لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ کھیل کر یہاں جوان ہوتے تھے لیکن ان کے بیاہ دور دور کر دیے جاتے تھے۔ اس محلے کی کوئی لڑکی اسی محلے میں دلہن بن کر نہ رہ سکی۔ یہاں کے لڑکوں کے قد بُت نکالتے ہی ماں باپ کو اپنی اپنی لڑکیوں کی فکر لگ جاتی تھی۔ بارات والوں کی خاطر مدارات کی وجہ سے ہمیں کبھی کبھی تو کئی ہفتوں تک اپنے آنگن کو استعمال کرنا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ میرے بزرگ لڑکی والوں کا ہاتھ بٹانے میں بھی پیچھے نہیں رہتے تھے۔ دریاں برتن، چارپائیاں، تخت وغیرہ ہر چیز جو وہ دے سکتے ان کے حوالے کر دیا کرتے۔ میونسپلٹی نے پانی پر ٹیکس لگایا تو بھی یہاں پانی کے استعمال پر کوئی روک ٹوک نہیں لگائی گئی۔ یہاں بجلی آگئی تو مہمانوں کو روشنی اور پنکھوں کی سہولتیں بھی دی جانے لگیں۔ ان کے لیے انھوں نے لڑکی والوں سے کبھی خرچ لینا گوارا نہ کیا۔

میرے بزرگوں کے نام سے یہاں کا ایک اور اہم واقعہ بھی وابستہ تھا۔ اسی محلے کے ہندو مسلمانوں کے درمیان ایک بار بڑا فساد مچا تھا۔ کچھ لوگ زخمی بھی ہوئے تھے کئی روز تک بڑی پکڑ دھکڑ ہوتی رہی تھی۔ لیکن میرے دادا اور بتا نے اپنی کوششوں سے ہندو اور مسلمانوں کو اسی آنگن میں جمع کر کے ایک دوسرے کے گلے ملوا دیا تھا۔ ان سب کی ٹھنڈے شربت اور مٹھائیوں سے تواضع بھی کی تھی۔

لیکن یہ آخری سال تھا۔ جب محرّم کا جلوس آیا تھا۔ ورنہ ہر سال جلوس تعزیہ لے کر کچھ منٹوں کے لیے یہاں رُک جاتا۔ اس کی تعظیم کے لیے اس آنگن میں سینکڑوں مشہور اور قابلِ احترام وکیل، ڈاکٹر، حکیم، عہدے دار اور بیوپاری لوگ گھنٹوں پہلے سے آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ جن میں مسلمان، ہندو اور سکھ شامل ہوتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی انگریز افسر بھی شامل ہو جاتا تھا۔ ماتم کرنے والے جو مرثیے پڑھا کرتے تھے ان کے کئی بند ہمیں زبانی یاد ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی تو میں خود اکیلے میں گانے لگتا تھا۔

دو لاکھ کے حلقے نے علم دار کو گھیرا
وہ چاند تو تھا بیچ میں اور گرد اندھیرا
اک تیر لگا چشم پہ اور سینے پہ بھالا
بند آنکھیں ہوئیں منہ سے لہو شیر نے ڈالا
رخصت ہوئے اب شہ سے علی اکبرِ ذیشاں

. . . .

جب میں انجینیرنگ کالج میں پڑھتا تھا اور ایک بار چھٹیوں میں گھر آیا تو اُن دنوں ڈاک خانے والے بھاردواج کی لڑکی ونتی کا بیاہ ہو رہا تھا۔ ونتی نے میرے ساتھ ہائی اسکول کا امتحان دے کر آگے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بیاہ میں پہلی بار میں نے بھی اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مہمانوں کی اچھی سیوا کر ڈالی۔ سویرے سے شام تک بھاگا بھاگا پھرا۔ ونتی کو میں نے ایک تحفہ بھی پیش کیا تھا۔ اُسے وِداع کرنے اس کے ساتھ اسٹیشن بھی گیا تھا۔ ونتی کا بھائی بیکنٹھ میرا گہرا دوست تھا۔ اس روز ہم دونوں ہی رو پڑے تھے۔ پتہ نہیں ہم کیوں رو پڑے تھے؟

بیٹھنے کے لیے میں موڑھا اٹھا لایا۔ موڑھے میں بالکل ڈوب کر اپنے آنگن کے چاروں طرف اوپر، آس پاس کے اونچے اٹھے ہوئے مکانوں کو دیکھا۔ یہ سب مکان تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد اونچے ہوتے گئے تھے۔ ان مکانوں کی کھڑکیوں میں کتنے چمکتے مسکراتے چہرے دیکھ چکا تھا۔ میری بہنوں، پرمیلا اور شکنتلا کی کتنی ہی سہیلیاں ـــــ مدھو، پریما، اُرملا، وغیرہ گلی پار کر کے اپنے اپنے مکان میں سے نکل کر کھیلنے کے لیے اسی آنگن میں آجاتی تھیں۔ اسی آنگن میں ان کے کتنے سارے گیت، سُریلے قہقہے اور کانوں کو بھلی لگنے والی کلکاریاں، چٹکلے اور طنز بکھرے پڑے تھے۔ ان کی بیاہ سمے کی دبی دبی چیخیں اور سسکیاں ابھی تک کانوں کے ساتھ ٹکراتی ہوئی جان پڑتی ہیں۔

اسی آنگن کے نرم مٹی والے فرش پر سیمتا بھی چل کر آیا کرتی تھی۔ کبھی صبح کبھی شام، کبھی جلتی دوپہر میں بھی وہ دبے پاؤں آنکلتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے قدم احتیاط سے اٹھاتی ہوئی! کوئی دوسرا دیکھ لیتا تو اس سے صبح کا اخبار یا ویکلی مانگ کر لوٹ جاتی تھی۔ میں سامنے آجاتا تو وہ مسرور ہو اٹھتی۔ پھر تو ہم برآمدے پر پڑی ہوئی نیلے بھاری پردوں والی چقوں کے باہر اس آگ سی دھوپ سے بھرے ہوئے آنگن میں پہروں کھڑے کھُس پھُساتے اور مسکراتے رہتے تھے۔ ہمارے گھر والے تو بند کمروں میں پانی کا چھڑکاؤ کر کے اور فل اسپیڈ پر پنکھے چھوڑ کر گہری نیند سوئے ہوئے ہوتے تھے۔ سخت گرمی اور پسینے سے شرابور ہو ہو کر چمکتا ہوا سیمتا کا وہ چہرہ اب بھی یاد آجاتا ہے تو نہ جانے کیسا لگنے لگتا ہے!

اسی جگہ میں نے اپنی بھابی اور ماں کی موجودگی میں آدھی آدھی رات تک سیمتا کو کئی کہانیاں سنائی تھیں۔ اپنی کالج کی زندگی کی دلچسپ شرارتوں کا حال سنا سنا کر اسے ہنسایا بھی تھا اور کبھی کبھی اپنی پی ڈبلیو ڈی کی سخت ملازمت کے قصے سنا کر

اسے فکرمند بھی بنا دیا تھا۔ اسی جگہ ایک رات بھابی نے اچانک ہی سیمتا کے سامنے مجھ سے پوچھ لیا تھا ــــــ "تم اب شادی کیوں نہیں کر لیتے نریندر؟ اس آنگن میں کتنا سوناپن ہے! ساتھ بات کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ تمہاری دلہن کے آجانے سے ہر طرف جھنکار سی بکھر جائے گی ــــ سچ کہتی ہوں!"

اس کی بات سن کر میں اور سیمتا دونوں ہی دیر تک گم سم سے بیٹھے رہ گئے تھے۔ ہماری خاموشی پر بھابی نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا تھا ــــــ "تم دونوں تو ایسے چپ ہو گئے ہو جیسے ایک دوسرے کو چاہتے ہو!"

ہم دونوں اس وقت بھی چپ ہی بیٹھے رہے تھے۔ ماں اس سمے گہری نیند میں ڈوبی خراٹے لے رہی تھیں۔ اسی وقت اوپر چھت پر سے بھیا نے بھابی کو پانی لے آنے کے بہانے سے پکار لیا تھا۔ بھابی ہماری طرف شرارت بھری نظروں سے مسکرا کر دیکھتی ہوئی اوپر چلی گئی تھی اور سیمتا مجھ سے کچھ کہے بنا ہی جلدی سے اٹھ کر اپنے گھر چل دی تھی۔ میں گلی کا دروازہ بند کرتے وقت وہاں بلا مقصد ہی کھڑا سا رہ گیا تھا۔

اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب اسی آنگن میں میں نے سیمتا کے دولہا اور اس کی بارات کا بھی سواگت کیا۔ یہ اس آنگن کا سب سے بڑا دلدوز واقعہ تھا۔ جسے میں پیار کرتا تھا اسے دوسرے مرد کے ساتھ وداع بھی کرنا پڑا۔ اب میں بچہ نہیں رہا تھا۔ پچیس برس کا تعلیم یافتہ اور ایک معقول سی ملازمت پر تعینات۔ اس بات کو بخوبی سمجھ چکا تھا کہ زندگی کے فیصلہ کن لمحوں میں چپ رہ جانے کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟

میرے بڑے بوڑھے ایک ایک کر کے پرلوک سدھار چکے تھے۔ اسی آنگن میں سے ہی ان کی ارتھیاں اٹھائی جا چکی تھیں۔ بھائی اور بھابی ایک دوسرے

شہر میں اپنا الگ مکان بنوا کر مجھے یہ سارا مکان سونپ گئے تھے ۔ یہاں اکیلا رہ جانے سے مجھے بڑی گھبراہٹ ہونے لگی تھی ۔ رات کو جب بستر پر لیٹتا تو مجھ پر یادوں کے پہاڑ ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگتے ۔ یادوں کی کچھ پریاں بھی آنکلتیں جو بہلاتی کم تھیں اور رلاتی زیادہ ۔

دن کے وقت : فتر جانے سے پہلے خود کو مصروف رکھنے کے لیے میں نل پر سے پانی بھر بھر کر سارے آنگن میں چھڑکتا پھرتا ۔ اتنا پانی بہاتا کہ چاروں طرف جل تھل ہو جاتا ۔ لیکن پیاسی دھرتی دیکھتے دیکھتے ہی سارا پانی سوکھ لیتی اور اپنے اندر سے ایسی سوندھی سی خوشبو اگلتی کہ میری نس نس میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ۔

بیاہ ہو جانے کے بعد سمیتا صرف ایک بار پھر اس آنگن میں آئی تھی ۔ مجھ سے ملنے کے لیے ہی آئی تھی ۔ اس دن بھی میں پانی بھر بھر کر آنگن میں چھڑکاؤ کرتا پھرتا تھا ۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ آگے بوٹوں اور کیاریوں کو بھی سینچتا پھر رہا تھا کہ اسے اچانک اپنے سامنے پا کر ٹھٹھک گیا ۔ جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا ۔ ہاتھوں میں بالٹیاں اٹھائے اور منہ میں دانتن دبائے ، حیران اور چپ ؟

میں نے مسکرا کر بالٹیاں نیچے رکھ دیں کمر میں اڑسا ہوا پاجامہ ٹھیک کیا اور اس کے پاس جا کر پوچھا ۔۔۔ "تم کب آئیں سمیتا ؟"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا ۔ ایک ٹک میری طرف دیکھتی ہی رہ گئی ۔ پتہ نہیں وہ میری آنکھوں میں کیا دیکھتی رہی ۔ پھر اس نے مجھ پر سے نظریں ہٹا لیں ۔ میرے اور اپنے آس پاس پھیلے ہوئے اس وسیع اور کشادہ آنگن کو دیکھنے لگی جس پر ہم دونوں کے وجود محض دو نکتوں ہی کے برابر تھے ۔

"چلو ، چل کر اس تخت پر بیٹھو نا !"

وہ اسی جگہ پر گڑی ہوئی سی کھڑی رہی ۔ وہ ایسے لباس میں تھی

جنھیں دلہنیں شادی کے بعد پہننے کی عادی ہوجاتی ہیں۔ اس کی مانگ میں سیندور کی ریکھا۔ اس کی رنگت کتنی بدل گئی تھی! شکل بھی جیسے بالکل دوسری ہوگئی تھی جس کا پہلے کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں کی اُداسی وہی تھی۔ محرومی کا گہرا نقش وہی تھا۔ وہ کتنی دیر تک کھڑی دیکھتی اور سوچتی رہی۔ اس کے ہونٹ کانپتے رہے اور اس کی آنکھیں غم ناک ہوتی گئیں۔ شاید آنسو روک نہ سکی تو جلدی سے پلٹ کر باہر چلی گئی۔

بس! یہی کچھ دکھانے کے لیے ہی یہاں تک آئی تھی! یہ تو میں جانتا ہی تھا! یہ سب تو مجھے معلوم تھا۔ اس کا احساس تو مجھے ہوتا ہی رہتا تھا۔ لیکن وہ میرے پاس آکر اس طرح اچانک لوٹ کیوں گئی؟ کچھ کہا تو ہوتا! کچھ دیر بیٹھ گئی ہوتی! نہ ہاں، نہ ہوں!!

اس کے بعد میں نے سمیتا کو کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے ڈیڈی کا کسی دوسرے شہر میں تبادلہ ہوگیا تھا۔ اب اس کا اس شہر میں کیا کام؟ وہ یہاں کیوں آئے گی؟ کس کے لیے آئے گی؟

آنگن کے سونے پن سے گھبرا کر میں نے شادی کرلی۔ نیتا کو گھر لے آیا نیتا کے یہاں قدم رکھتے ہی سچ مچ ہر طرف جھنکار سی بکھر گئی جیسا کہ بھابی نے اک بار کہا تھا۔

میں موڑھے میں ڈوبا ڈوبا سا اپنے آنگن کو آبدیدہ سا دیکھ رہا تھا بیلوں، بوٹوں اور پیڑوں کی سوکھی زرد پتیاں میرے چاروں طرف فرش پر اڑتی اور روتی پھرتی تھیں۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو میں چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اسی لمحے نیتا بھی وہی دستک سن کر برآمدے کی ڈاٹ کے نیچے آکر رک سی

گئی۔ اس کے صبح کے دھوئے ہوئے لمبے کالے بال ابھی تک اس کی پیٹھ پر ہی بکھرے ہوئے تھے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف بنا پلکیں جھپکائے دیکھا اور پھر سر جھکالیا۔ میں جلدی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازے پر پنجاب نیشنل کے ڈپٹی پوری جی ہی تھے۔ بڑی معذرت سے بولے ــــــ ”بھئی معاف کرنا نریندر، تمھیں ناحق تکلیف دی۔ دراصل میں یہ کہنے آیا ہوں کہ اب مجھے اس آنگن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کیونکہ پونٹی اور شیکھر نے صرف چار چھ جنوں کے ہی سامنے بغیر کسی غل غپاڑے کے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ کہتے ہیں، ہم ہنگامے اور دعوت کا روپیہ بچا کر کسی پہاڑ پر چلے جائیں گے۔ میں نے بھی منظوری دے دی ہے۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ بہرحال آپ کی کو آپریشن کا بہت بہت شکریہ!“

اتنا کہہ کر وہ تو پلٹ گئے مگر میں بالکل گم صم سا اپنے آنگن کی طرف دیکھنے لگا۔ چاروں طرف سے اونچے اونچے مکانوں سے گھرے ہوئے آنگن کی طرف

جب میں نے آنگن کو پار کیا تو مجھے یوں لگا جیسے وہاں چلتے چلتے کئی گھنٹے بیت گئے ہیں۔ کئی سال۔ جب دوسرے کنارے پر پہنچا تو میں بالکل تھک چکا تھا۔ میرے سامنے نیٹا کھڑی تھی۔ اوپر کو سمیٹی ہوئی چھت کے نیچے۔ دلکش مگر چپ اور مضبوط۔ اپنی ضد پر جمی ہوئی۔

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ ”تم بلاوجہ ہی ناراض ہوگئیں، نیٹو، چاو چلو چائے بلواؤ پھر بیٹھ کر اس آنگن کا نقشہ بدلنے کا اسٹیمیٹ بنائیں گے۔“

داماد

گاڑی صبح پانچ بجے پہنچی۔ جاڑوں کے دن تھے۔ ابھی ہر طرف رات کا سا سماں تھا۔ مول چند اس گاڑی سے اُترنے والا پہلا مسافر تھا۔ کاندھے پر بستر رکھ کر جب وہ ٹکٹ بابو کو اپنا انبالہ سے نابھہ تک کا ٹکٹ دے کر اسٹیشن سے باہر آیا تو اُسے دیکھ کر تین تانگے والے ایک ساتھ اس کی طرف دوڑ پڑے جو سڑک کے بیچ خشک پتّے اور ڈنڈے جلا کر بڑے اطمینان سے بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔

"باؤ جی، میں چورستے تک جا رہا ہوں۔ آئیے۔"

"نہیں باؤ جی ادھر آ جائیے۔ میں کسی اور سواری کا انتظار نہیں کروں گا۔ لائیے بستر مجھے دیجیے۔" اس تانگے والے نے اس سے بستر چھین لینے کی کوشش سی کر ڈالی۔

تیسرا تانگے والا غرّا کر بولا— "ابے چھوڑ بستر کو۔ پہلے میں نے اسے ہاتھ لگایا ہے۔"

وہ آپس میں ہی جھگڑنے لگے۔ مول چند بڑی مشکل سے ان کے ہاتھوں سے اپنا بستر واپس لے سکا اور اسے پھر سے کندھے پر رکھ کر چنگی کے بغل والے ٹی اسٹال کی طرف بڑھ گیا۔

وہ شکن در شکن خاکی پتلون کے اوپر ایک سوکھی ہوئی کائی کے رنگ کا بند گلے کا کوٹ پہنے تھا۔ ٹی اسٹال کے لیمپ کی دھندلی روشنی میں اس نے بیٹھنے کی جگہ دیکھی۔ اس کے سر پر لپٹا ہوا اونی گلوبند کھل کر اس کے گلے میں جھولنے لگا۔ اس کے تیل سے چپڑے ہوئے بال عجیب طرح سے اس کی کھوپڑی کے ساتھ چپک کر رہ گئے تھے۔ لیکن بالوں کی تقسیم اب بھی دکھائی دے رہی تھی۔

"سردار جی چائے پلواؤنا، گرم گرم!" اس نے سخت کھردرے لہجے میں ٹی اسٹال کے مالک کو مخاطب کیا اور میز کے اوپر ہی اپنا بستر رکھ کر لوہے کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہاں دو اور آدمی بھی چائے پی رہے تھے۔ ایک قلی تھا جو اُسے سامان کے ساتھ آتے دیکھ کر چونک اٹھا اور "ہائیں! شٹل آگئی!" کہہ کر اسٹیشن کی طرف بھاگ نکلا۔

سردار نے چائے کے گلاس میں چمچ ہلاتے ہلاتے مول چند سے پوچھا۔۔۔

"باؤجی چائے میں نمک بھی چھوڑ دوں؟"

"نہیں نہیں، ہماری طرف نمکین چائے پینے والے کو جاہل سمجھا جاتا ہے۔" یہ کہہ کر مول چند مسکرا بھی دیا۔ سردار اور دوسرے آدمی نے جو وہاں بیٹھا چائے پی رہا تھا اس کی طرف چونک کر دیکھا۔ جس آدمی کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں اور جو چائے میں ڈوب ڈوب جاتی تھیں اس سے مول چند کی بات سن کر جیسے نہ رہا گیا۔ پوچھا۔۔۔ "کہاں سے آرہے ہو؟"

مول چند نے ہولے سے کھنکار کر بتایا: "انبالے سے" اور اس کے چہرے

پر ایسے طمینان اور فخر کی جھلک بھی آگئی جیسے انبالہ کوئی معمولی شہر نہ ہو بہت بڑی مملکت ہو!

انبالہ کا نام سن کر اس آدمی نے اتنی لمبی ہوں ں ں ں!!! کھینچی جس کا صاف صاف مطلب یہی نکلتا تھا ــــ سمجھ گیا۔ تو انبالے کا ہی ہو سکتا ہے!!

اس نے اپنی ٹوپی کے نیچے سے کھسکتے ہوئے بالوں کو کانوں کے پیچھے جمایا اور خاکی اوور کوٹ کے چوڑے کالروں کو کانوں تک کھڑا کر کے بڑے تمسخر سے پوچھا ــــ "پیرو وانا خاندان کا تو نہیں ہے ــــ تو؟"

"تو نے کیوں کر پہچانا؟" مول چند کے چہرے پر حیرانی پیدا ہو گئی۔ اس نے جلدی جلدی بچی ہوئی ساری چائے ایک گھونٹ میں نگل لی۔

اس آدمی نے اسی تمسخر بھرے لہجے میں کہا ــــ "تیری باتوں سے ہی تجھے پہچان گیا۔"

اس پر سردار بھی ہنس پڑا۔ مول چند کھسیانہ سا ہو کر کنپٹی کھجانے لگا۔ بولا "میں یہاں کے اترادیوں کا داماد ہوں۔"

"بس بس سمجھ گیا۔ سمجھ گیا۔ اب کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ تیری ہی عورت تجھے چھوڑ کر باپ کے گھر چلی آتی تھی نا!"

یہ سن کر مول چند کے چہرے پر ندامت سی پُت گئی۔ لیکن اس نے جلدی ہی خود کو بشاش بنا لیا۔ مسکرا کر پوچھا ــــ "تو ان کا کوئی بھائی بند نہ ہو تو ایک بات کہوں ــــ میری سسرال والے ہیں بڑے شوّر! پر تیرا نام کیا ہے یار!"

مونچھوں والے نے پہلے اسے اپنا نام بتایا پھر کہا ــــ "شوّروں کو شوّر ہی تو ملا کرتے ہیں!"

"لیکن یار تارے، تھوڑی بہت کھٹ پٹ کس گھر میں نہیں ہو جاتی؟

کبھی کبھی تو رسوائی کے بھانڈے تک ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ ذراسی بات کا بتنگڑ ہی بنا دیا جائے اور جگہ جگہ اس کا ڈھول پیٹا جائے! کا بھی دیا جائے!"

"پر میں نے تو یہ سُنا تھا تو نے اپنی دلہن کو گھر لے جاتے ہی اس سے سب کچھ چھین لیا۔ گہنا، کپڑے، سارا جہیز تک —— اور بے چاری کے ساتھ سیدھے منہ بولنا تک بھی پسند نہ کیا!"

"نہیں یار، یہ تو مجھے بدنام کرنے کے لیے کہا گیا۔"

"پر شانتی نے بھی تو تمہارے ہاں سے لوٹ کر یہی بتایا تھا۔!"

"تو میری بیوی کا نام بھی جانتا ہے؟ تو نے بتایا نہیں تارے؛ تو اُن کا لگتا کیا ہے؟"

تارے نے بڑی بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا قمیص کے سب سے اوپر والے دو بٹن کھول دیے۔ بند گلے کی گرفت اچانک ہی تنگ ہوتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ کہا "میں ان کا پڑوسی ہوں۔ شانتی اور میں بچپن میں ساتھ کھیلے ہیں۔ وہ میرے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتی۔ اس پر تمہارے یہاں جو کچھ بیتی وہ اس نے مجھے حرف بہ حرف بتا دی تھی۔"

اُسی لمحہ وہ قلی جو تھوڑی دیر پہلے بھاگ کر چلا گیا تھا سر پر ایک بڑی سی بوری اٹھائے ایک مسافر کو ساتھ لیے وہاں آگیا۔ اس نے تارا سے کہا —— "باؤجی ان کے برتنوں کا محصول لے لیجیے۔"

تارا تھوڑی دیر کے لیے اٹھ کر چنگی پر چلا گیا۔ جب لوٹا تو صبح کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ مول چند بالوں کو گیلا کر کے ان میں کنگھی پھیر رہا تھا۔ اس نے اب مفلر کو بڑے سلیقے سے گلے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ ٹی اسٹال والے سردار نے

اب تک بالکل خاموش رہ کر ہی ان دونوں کی باتیں سنی تھیں۔ اس نے ایک لمبی سانس چھوڑ کر مول سے پوچھا ـــــ "تو اب تو اپنی عورت کو لے جانے کے لیے آیا ہے!"

"ہاں آیا تو اسی لیے ہوں۔ پر پتہ نہیں وہ لوگ دل میں کیا سوچ بیٹھے ہیں!"

مول چند کے لہجے میں اب بڑی مایوسی تھی۔ جو تھوڑی دیر پہلے تک نہیں تھی۔ سردار نے سر گھما کر تارا کی طرف دیکھا اور کہا: "تم ہی کیوں نہ بیچ میں پڑ کر ان کی صلح صفائی کرا دو!"

تارے نے کوئی جواب دینے کی بجائے مونچھوں کے نیچے سے جھانکتے ہوئے ہونٹ بھینچ لیے اور ٹین کی چھت کو گھورنے لگا۔ کنکھیوں سے مول چند کی طرف بھی دیکھا جو جیب میں سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر سگریٹ پینے لگا تھا۔ مول چند نے اُسے سگریٹ پیش کی تو اس نے خاموشی سے قبول کر لی۔ ناک اور منہ سے دھواں چھوڑتے ہوئے بولا ـــــ "دیکھ بھئی مول چند، جب تو نے شانتی کو ناراض کر کے میکے لوٹا دیا تو تیرے اس سلوک کی وجہ پوچھنے کے لیے تیرے پاس یہاں کی کچھ عورتیں گئی تھیں۔ تو نے ان کے ساتھ بھی بدسلوکی کی۔ انھیں گالیاں دیں اور پیٹا بھی! ان عورتوں میں ایک میری ماں بھی تھی۔"

مول چند نے حیران ہو کر پوچھا ـــــ "ان میں تیری ماں کونسی تھی، یار؟"

"وہی جس کا تو نے ماتھا لہولہان کر دیا تھا۔ بچاری سر پر پٹیاں بندھوا کر وہاں سے لوٹی تھی۔"

مول چند نے جیسے کوئی بھولی بسری ہوئی بات یاد کرنے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کی جھلک بھی آئی۔ اس نے کہا ـــــ "یار تارے،

اگر تیری ماں وہی تھی تو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سارے فساد کی جڑ وہی تھی۔ جھگڑا بڑھانے کے لیے وہی سب عورتوں کو لے کر آئی تھی۔ سب سے پہلے گالیوں کی شروعات بھی اس نے کی تھی۔ نہ تو مجھے چھوڑا نہ ہی میرے بہن بھائیوں کو اور تو اور میرے ماں باپ اور پرلوک سدھار چکے ہوئے بزرگوں تک کو اس نے نہ بخشا!"

"یہ بالکل جھوٹ ہے!" تارا گرج کر بول اٹھا——"میری ماں کہتی ہے پہلے تو نے گالی دی تھی۔"

"سولہ آنے غلط!" تارا چند جی یہ سولہ آنے غلط ہے! اچھا بتا، اُس کا میرے سسرال والوں اور میرے جھگڑے سے واسطہ ہی کیا تھا؟ اُس نے کیوں جلتی پر تیل گرایا۔"

یہ سن کر تارا چند کے چہرے پر ایک زہر خند مسکراہٹ ابھری۔ بولا——"یہ تو تو ہی سمجھتا ہے کہ ہم ان کے کچھ نہیں لگتے! لیکن مول چند یہ مت بھول کہ کبھی کبھی پڑوسیوں کے رشتے اپنوں سے بھی زیادہ گہرے ہو جایا کرتے ہیں۔ میری ماں سے شانتی کے آنسو نہ دیکھے جاسکے تبھی تو تجھ سے جواب لینے کے لیے وہاں پہنچ گئی! لیکن تو نے اسے مار پیٹ کر واپس کر دیا!"

یہ کہہ کر تارا چند اپنی ٹوپی کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر مار مار کر جھاڑتا ہوا باہر چلا گیا۔ مول چند کچھ دیر تک تو بالکل چپ سا بیٹھا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے؟ چائے والا سردار اسے گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ مول چند نے اسی کے دل میں اپنے لیے ہمدردی پیدا کرنے کی غرض سے کہا——"میں دیوی کی سوگندھ کھا کر کہنے کے لیے تیار ہوں——میں نے پہلے گالی نہیں دی۔ نہ ہی ہاتھ اٹھانے میں پہل کی تھی۔ تارے کی ماں نے ہی پہلے گالی دی اور میری بیمار ماں کو مارنے کے لیے پہلے اینٹ بھی اُسی نے اٹھائی تھی۔ بچاری کے اینٹ لگ،

گئی ہوتی تو اس کی ترنت ہی جان نکل جاتی اور بھرتائے کی ماں پھانسی کے تختے پر لٹکتی دکھائی دیتی۔ وہ تو میں نے ہمت سے کام لیا کہ آگے بڑھ کر اس کی کلائی مروڑ دی۔!"

سردار نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ مول چند اسے جائے کے دو آنے دے کر وہاں سے چل پڑا۔ بستر کو پھر سے کاندھے پر رکھ کر اور سگریٹ بیتا ہوا۔ قصبے کو جانے والی سڑک پر۔

اب روشنی کافی پھیل گئی تھی۔ سورج نیم اور کیکر کے درختوں کے پیچھے سے جھانکنے کی بجائے اب ان کی اونچی شاخوں سے بھی اوپر نکل آیا تھا۔ سڑک پر اب لوگ بھی آتے جاتے دکھائی دینے لگے۔ لیکن ان میں مول چند کی جان پہچان کا کوئی بھی نہیں تھا۔ وہاں اسے کم ہی لوگ جانتے تھے۔ شادی کے بعد پہلی بار وہ اب یہاں آیا تھا۔ اسے اس بات کی بہت پشیمانی ہو رہی تھی کہ اس کی بیوی اکیلی ہی میکے لوٹی تھی۔ وہ اسے چھوڑ جانے کے لیے ساتھ نہیں آیا تھا۔ دراصل وہ اپنی بیوی کی تنک مزاجی برداشت نہیں کر سکا تھا۔ اسی وجہ سے اس سے ناخوش ہوا تھا۔ لیکن اب اس کے دل میں کوئی کرودھ نہیں تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جانا چاہتا تھا۔

اس نے اپنے سسر کو کئی خط لکھے تھے۔ اپنے پھوپا کو بھی ان کے پاس صلح صفائی کے لیے بھیجا تھا جو ان کے خاندان کے بہت ہی سمجھدار اور عزّت دار بزرگ تھے۔ لیکن ان کی بھی کوئی نہیں چلی تھی۔ اس کا باپ مر چکا تھا۔ پچھلے سال ماں کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی موت کی اطلاع اس نے سسرال والوں کو بھجوا دی تھی لیکن یہاں سے بس دو حرفی خط اظہار افسوس کے لیے گیا تھا۔ آخری رسومات کے ادا ہونے کے وقت تک ان کی طرف سے کوئی نہیں پہنچا تھا۔ لیکن اس کے دل میں اس بات کی بھی کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ تو صرف

فوری طور پر صلح کا ہی خواہش مند تھا۔ اسی لیے وہ خود ہی چلا آیا تھا۔

کچے اور پکے مکانوں کی کئی گلیوں میں سے ہوتا ہوا وہ بالآخر سسرال کے دروازے پر پہنچ گیا۔ لیکن وہ دروازے پر ہی رک گیا۔ ایک سوچ میں پڑ گیا۔ کہیں سسرال والے بھی اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک نہ کر گزریں جس کے لیے اس پر الزام دھرا جاتا تھا۔

وہ ابھی کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اسی گلی کے ایک دوسرے مکان میں سے شانتی نمودار ہوئی۔ سر پہ لال مرچوں سے بھری ہوئی چھکورا اٹھائے ہوئے۔ اسے دیکھتے ہی شانتی گھبرا اٹھی۔ کچھ شرمائی کچھ سمٹی اور سکڑی پھر اپنے پیچھے پیچھے لال مرچوں کی افشاں سی گراتی ہوئی جلدی جلدی اپنے گھر کے اندر بھاگ گئی۔

اپنی بیوی کو دیکھ کر مول چند خوش بھی ہوا تھا اور اداس بھی ہو گیا۔ شانتی نے اس سے دور رہ کر شادی شدہ عورتوں کے سے رنگین ریشمی کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کی مانگ میں سیندور بھی بھرا ہوا تھا۔ وہ کتنی دلکش معلوم ہوتی تھی! لیکن وہ کس قدر اداس بھی تھی! اس کے چہرے پر سب کچھ لکھا ہوا تھا۔ اپنے پتی سے جدا ہو جانے پر ایک عورت کی جو بھی کیفیت ہوتی ہے۔ مول چند دل مسوس کر رہ گیا۔

کتنی دیر تک وہ دروازے کے اندر جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ اسی طرح کھڑا سوچتا ہی رہا۔ شانتی کی ایک ہی جھلک پا کر وہ مسرور ہونے کی کوشش کرتا رہا۔ شانتی تو بجلی کی طرح چمک کر آناً فاناً غائب بھی ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سے جھانکتی ہوئی خوشی پر ندامت بھی غالب آ رہی تھی۔

اچانک اندر سے ایک بوڑھا کھانستا ہوا باہر آیا۔ وہ اس کا سسر تھا۔ شانتی نے ہی اندر جا کر اس کی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ مول چند نے

بستر زمین پر رکھ کر سسر کے چرن چھوئے۔ سسر نے بھی اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعائیں دیں۔ اس نے مول چند کا بستر اٹھا لینا چاہا لیکن مول چند نے اُسے ایسا نہ کرنے دیا۔ خود ہی اپنا بستر اٹھا کر اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا آیا۔

مول چند کو دیکھتے ہی گھر کے چھوٹے بڑے سبھی لوگ آنگن میں جمع ہو گئے شانتی کی ماں، اس کی چاچی، بڑی بہن، دو ایک ایسی عورتیں جنھیں وہ پہچان نہیں پا رہا تھا۔ لیکن کسی نے اس کی خیریت نہ پوچھی۔ نہ ہی کسی نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ عورتیں اپنے چہروں پر ایک عجیب سا تناؤ لیے کھڑی رہیں۔ اُس کے سسر نے آگے بڑھ کر دیوار سے لگی ایک کھاٹ گرا کر اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ خود ڈاٹ کے نیچے جا کر چلم پینے لگا۔

چند منٹ تک بڑی سنگین سی خاموشی رہی۔ مول چند نے ایک ایک عورت کو دیکھا۔ لگتا تھا وہ کسی بھی لمحے ایک ساتھ اس پر برس پڑیں گی۔ آخر شانتی کی ماں نے ہی خاموشی کو توڑا۔ بولی "تو اب یہاں کیا لینے آگیا ہے؟ اگر شانتی کو ساتھ لے جانے کے خیال سے آیا ہے تو ابھی لوٹ جا! اب کبھی بھولے سے بھی شانتی کا نام زبان پر مت لانا سمجھا؟"

اس کے بعد شانتی کی چاچی بھی بول اُٹھی "تو نے بالکل ٹھیک کہا بہن۔ ہم اپنی لڑکی ایسے بے حیا کے ساتھ نہیں بھیج سکتے۔"

مول چند نے بڑی کوشش سے تھوک نگلا۔ اور اسی وقت پڑوس کی کم اونچی دیوار پر سے ایک عورت نے ان سب کی طرف بڑی حیرت سے تاکا۔ پھر مول چند کو غور سے دیکھا جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

شانتی کی چاچی چلا کر بولی ــــ "تارے کی ماں، پہچانتی کیوں نہیں؟ ہمارا لائق داماد ہی تو ہے جس نے پار سال ہم سب کو مار مار کر گھر سے نکال دیا تھا۔"

"ہائے! تبھی میں کہوں، آج سورج الٹی طرف سے کیوں نکلا ہے؟ سوچا ضرور کوئی انہونی بات ہوئی ہے۔ تم لوگوں کی آوازیں سنیں، تو دیوار پر سے جھانکنے چلی آئی۔"

تارے کی ماں پہلے تو ناک پر انگلی رکھ کر مول چند کو گھورتی رہی پھر اچانک دیوار پھاند کر ان سب کے بیچ آکر کھڑی ہو گئی۔ اور کولہوں پر ہاتھ رکھ کر سب سے پوچھنے لگی ــــ "تو کیا سوچا ہے تم نے؟ شانتی کو جھٹ پٹ سجا سنوار کر اس قصائی کے ساتھ روانہ کر کیوں نہیں دیتی؟"

"ہے ہے تو سمجھتی ہے لڑکی مجھ پر ایسی بھاری ہوئی ہے! میں تو اپنی گئو بیٹی کو اس کے حوالے نہیں کروں گی۔ کچھ کہے گا تو جوتی سامنے رکھ دوں گی۔ ہاں!"

اس کی ساس غصے سے دو ٹوک سنا کر وہاں سے چلی گئی۔ جا کر رسوئی کے اندر بیٹھ رہی۔ دوسری عورتیں بھی اس کے پیچھے پیچھے لپکی ہوئی سی چلی گئیں۔ لگیں پوچھنے ــــ

"تو اسے روک کیوں رکھا ہے؟ صاف صاف کہہ دو ــــ دفع ہو جائے!"

"تو کیا دھکے مار کر نکالوں؟ سن رہا ہے۔ بہرہ تو نہیں ہے!"

شانتی کے باپ نے چلم پیتے پیتے اور کھانستے کھانستے انھیں سمجھایا۔ بولے اے بُری عورتوں! داماد کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کیا کرتے۔ اگر کوئی سنے گا تو ہماری ہی ناک کاٹے گا۔ اس سے چائے پانی پوچھو، چائے پانی!"

اس کی بیوی چلا کر بولی ــــ "تم بیچ میں مت بولو جی، چپکے بیٹھے چلم پیو۔"
لیکن وہ تب بھی خاموش نہ رہ سکا ــــ "تو کیا اس کی جان ہی لے کر لوگی؟"

سب عورتیں بھڑوں کی مانند جھنجھلا کر باہر نکل آئیں ـــــ "اس نے بھی ہماری جان لے لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ دی تھی۔"

"اجی کلہاڑی اٹھا کر ہم سب کے پیچھے لگ گیا تھا۔ ہم بھولی نہیں ہیں۔"

بہا چاچا تمہارا دل بیٹی کے لیے دُکھا ہوتا تو تم خود ہی نہ اس کے پاس گئے ہوتے! ہم وہاں جا کر اپنی بے عزتی کیوں کراتیں؟"

عورتوں نے ڈانٹ کر بوڑھے کو چپ رہنے پر مجبور سا کر دیا۔ بوڑھا گالوں میں دھواں بھر بھر کر چھوڑنے لگا۔ مول چند کتنی دیر سے اپنے اوپر ایک بے بسی اور ندامت سی طاری کیے بیٹھا تھا۔ یکایک وہ عورتوں اور بوڑھے کا مکالمہ سن کر مسکرا دیا۔ اس نے عورتوں کی طرف بے خوفی سے دیکھا اور کہا ـــــ "اگر آپ کے گھر میں بھی کوئی کلہاڑی ہو تو لے آیئے۔ مجھے ماریئے۔"

"ہائے کتنا بے شرم ہے یہ تو۔ کیسی ڈھٹائی کی باتیں کرتا ہے۔"

"اے اے لڑکے، کیا سمجھتا ہے خود کو؟ مار مار کر چھٹی کا دودھ یاد کرا دیں گے!"

"اب یہاں سے جاتا کیوں نہیں؟"

وہ لال لال آنکھوں سے اسے گھورنے لگیں۔ لیکن مول چند نے ہنستے ہوئے جواب دیا ـــــ "اکیلا تو جاؤں گا نہیں! میری بات بھی پلے سے باندھ لیجیے۔"

"کوئی زبردستی ہے کیا؟ جا نہیں بھیجتے شانتی کو تیرے ساتھ۔ تو کیا کر لے گا؟" یہ کہتے کہتے نایے کی ماں اپنا ہاتھ اتنا آگے بڑھا لے گئی کہ مول چند گرتے گرتے بچا۔ لیکن پھر بھی وہ مسکرا کر بولا "تو کب تک جوان لڑکی کو گھر بٹھائے رہو گے؟"

"جب تک ہمارا جی چاہے گا۔ تو کون ہوتا ہے پوچھنے والا۔ ؟ لڑکی جوان ہے تب بھی ڈر کس بات کا ہے؟ ایسی اصیل گائے تو کسی کے گھر میں نہیں ہوگی۔ یہ تیری بہن کی طرح منہ زور نہیں جو شادی سے پہلے ہی رسہ تڑا تڑا کر بھاگ کھڑی ہوتی تھی۔"

مول چند نے بھی تاسے کی ماں کو ترکی بہ ترکی جواب دیا۔۔۔ "جب اسے میرے ساتھ بھیجنا منظور نہیں ہے تو اسے کسی دوسری جگہ ہی بیاہ دو۔ تم ہی اپنے بیٹے کے لیے کیوں نہیں گھر میں ڈال لیتیں؟"

تاسے کی ماں ہکا بکا رہ گئی۔ پھر جھٹ پٹ سر سے کپڑا اتار کر شانتی کی ماں کے آگے جھولی پھیلا کر بولی۔۔۔ "میں تو سات بار چوم کر اس بچی موتی کو سویکار کر لوں۔ میں تو اپنے بیٹے کی آنکھوں میں بھی ہر وقت اسی کی تصویر دیکھا کرتی ہوں۔۔ اس وقت بھی میں نے تاسے کے لیے ہی جھولی پھیلائی تھی۔ یاد ہے! پر تو نے نہ جانے اس منحوس میں کون سے گن دیکھ کر میری بات کا جواب تک نہیں دیا تھا۔" یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔

شانتی کی ماں نے اسے کوئی جواب دینے کے بجائے سر جھکا لیا۔ شانتی کی چاچی نے آگے بڑھ کر مول چند کے سر پر ہلکی سی دھول جما دی اور کہا "تجھے شرم نہیں آتی اپنی عورت کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہوئے؟"

"پر تم لوگ اسے میرے ساتھ بھیجتے کیوں نہیں؟" مول چند کے چہرے پر وہی ہنسی تھی۔

"پر تو نے اس کے گہنے اور کپڑے کیوں چھین لیے تھے؟"

"جب ہم تیرے پاس گئیں تو تو نے ہمیں پیٹا کیوں؟"

مول چند نے چاہا انھیں کوئی جواب دے لیکن تاسے کی ماں بول پڑی ۔۔۔ "کیا یہ سچ نہیں تو نے اپنی شادی کرائی ہی اس لیے تھی کہ سارا جہیز بہن کی

شادی ہیں دے سکے۔"

"ہاں ہاں یہ سچ ہے۔ بالکل سچ ہے۔" مول چند چارپائی پر سے اٹھ کر ان کے پاس چلا گیا۔ تم سب تو بڑی رئیس ہو نا؟ تم میں سے کسی نے آج تک اپنی بیٹی کی شادی میں ایسا سامان شامل نہیں کیا ہوگا جو تمہاری بہوئیں لے کر آئی ہوں گی۔ نہیں نا!"

سب عورتیں چپ کھڑی رہ گئیں۔ کسی نے جواب نہ دیا۔ ڈاٹ کے نیچے چلم بھرتا ہوا شانتی کا باپ ان کی طرف بڑے طنز سے دیکھ کر بولا "جواب دو۔ لڑکے نے کیا پوچھا ہے؟ اب ہونٹ کیوں سی لیے؟"

ایک عورت نے کافی جھجک سے شکایتی لہجے میں پوچھا ــــ "پر تو نے شادی کرنے سے پہلے جھوٹ کیوں بولا کہ تجھے نوکری ملی ہوئی ہے۔ تو اُس سمے تو بیکار تھا نا!"

مول چند نے ہاتھ جوڑ دیے "بس بابا بس! اب میرے سارے قصور معاف کر دو۔ جو قصور مجھ سے ہوئے اور جو قصور نہیں بھی ہوئے۔ سب معاف کر دو۔"

عورتوں کے چہروں پر ہنسی دوڑ گئی۔ شانتی کی چاچی بولی ــ "پہلے تو اس سے معافی مانگ جس کا تو نے ماتھا پھوڑ دیا تھا"

مول چند نے تارے کی ماں کی طرف دیکھا۔ اپنی آنکھوں میں شرارت کی چمک بھی لے آیا۔ اور جلدی سے اس کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گیا۔ تارے کی ماں نے پاؤں چھڑانے کی کوشش کی۔ اس کے بال نوچے اُسے پیچھے ہٹانے کی کوشش کی اور ہنستے ہوئے کہا ــــــ "چاچا پہلے اپنی ساس کے پاؤں پکڑ لڑکے۔ جسے کبھی سکھ کی نیند بھی نصیب نہیں ہوئی۔ اس کے پاؤں چھوئے گا تو

بچاری کے کلیجے میں کچھ ٹھنڈک بھی پہنچے گی۔"

مول چند اس کے پاؤں چھوڑ کر ساس کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گیا۔ شانتی کی ماں کو گدگدی سی ہونے لگی۔ اس نے ہنستے ہنستے مول چند کے سر پر کئی بار چپت لگائی۔ لیکن اس نے تب تک پاؤں نہ چھوڑے جب تک اس کی ساس نے بہو کو پکار کر کہہ نہ اٹھی ــــ "اری کوئی اس کے لیے گرم گرم دودھ لے آ۔ نہیں تو جہاں بیٹھے گا ہماری ناک کاٹتا پھرے گا۔"

اس نے باری باری سبھی عورتوں کے پاؤں چھوئے۔ تب سب عورتیں اسے گھیر کر بیٹھ گئیں اور لگیں بڑے پیار سے خیریت پوچھنے "تیری ماں جب مری تو تو گھٹیا کے درد سے کہیں آنے جانے سے مجبور تھی۔ بڑا دکھ ہوا بچاری کے مرنے کا۔"

یہ کہتے کہتے شانتی کی ماں نے آنکھوں سے آنسو بھی بہا کر دکھا دیئے۔ شانتی کی بھابی بھی دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتی ہوئی بولی ــــ "اے مول چند تو اس سمے اپنی ماں کے پاس ہی تھا نا جب اس نے پران تیاگے تھے! اس کے سر کے نیچے اپنا دایاں گھٹنا رکھ کر بیٹھا تھا نا؟"

تارے کی ماں نے کہا ــــ "ہاں جن ماؤں کے مرتے سمے ان کے بیٹے اپنا دایاں گھٹنا ان کے سر کے نیچے رکھ کر بیٹھتے ہیں وہ سیدھی سورگ لوک پہنچ جاتی ہیں۔"

مول چند نے جواب دیا ــــ "ٹھیک کہتی ہو موسی! تم بھی اپنے بیٹے کو سدا اپنے ساتھ ہی رکھا کرو۔ کیا پتہ کب پران نکل جائیں تمھارے!"

تارے کی ماں نے ہنس کر اس کے سر پر ایک چپت جڑ دی۔ دوسری عورتیں بھی ہنس پڑیں۔ لیکن جیسے ہی انھیں ہنسنا اچھا نہ لگ رہا ہو۔ جلدی ہی سنجیدہ ہو گئیں۔ ایک عورت نے پھر ہمدردی دکھائی ــــ "مول چند تیری ماں کو ہوا کیا تھا؟ اس کے تو ٹھیک ٹھاک تھی بچاری جب میں اسے دیکھ کر آئی تھی۔"

"بس آپ کی نظر کھا گئی اُسے! آپ کے جانے ہی وہ بستر سے لگ گئی تھی۔"

مول چند اِن کی مکّاری سے خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"اس چندرے کے ساتھ اب کوئی بات نہ کرو۔ ہاں!"

ایک عورت رسوئی میں سے دودھ سے لبالب بھرا ہوا گلاس لے آئی جس پر گاڑھی گاڑھی بالائی بھی کافی مقدار میں پڑی ہوئی تھی۔

"اچھا اچھا لے اب۔ دودھ پی لے۔"

اچانک ایک عورت کو شانتی کی یاد آئی تو وہ یہ کہتی ہوئی اندر بھاگی: "ہائیں شانتی کہاں ہے؟ اس نے کنگھی چوٹی کی یا نہیں؟ وہ تو کئی کئی روز تک اپنی سدھ بھی نہیں لیتی!"

مول چند زیادہ چھٹی لے کر نہیں گیا تھا۔ اسے اسی شام کو لوٹنا بھی تھا۔ انبالہ میں اسے اپنے صاحب کے بنگلے میں نوکروں کا ایک کوارٹر ملا تھا۔ اس پر وہ جلدی سے قبضہ نہ کر لیتا تو کوئی دوسرا چپراسی اس میں گھس کر بیٹھ جاتا۔

شانتی کو ساتھ بھیجنے کے لیے جلدی سے تیار کر دیا گیا۔ اسے ساتھ لے جانے کے لیے سوغاتیں بھی دی گئیں۔ محلے کی بہت سی عورتیں اسے چوراہے تک چھوڑ آنے کے لیے ساتھ ہو لیں۔

مول چند نے بڑی بوڑھی عورتوں کے پاؤں چھوئے تو انھوں نے آشیرواد دیا اور شگن کے دو دو ایک ایک روپیہ بھی دیے۔ اس وقت ان سب کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

تنگ گلی کے سرے پر تانگا کھڑا ہوا تھا۔ تانگے والا اس کا بستر اٹھا کر لے جا چکا تھا۔ شانتی کے باپ نے بھی ایک مٹھائی کی ٹوکری اٹھا رکھی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے تارا چند بھی کاندھے پر ایک ٹرنک اٹھائے اور سر جھکائے

دھیرے دھیرے جا رہا تھا۔ مول چند کے پیچھے پیچھے ایک چادر میں چھپی ہوئی شانتی تھی جسے عورتیں اپنے گھیرے میں لیے اور قدم قدم بڑھاتی ہوئی تانگے کے پاس چھوڑ کر رک گئی تھیں۔

سن سس

"افوّہ، اس کام میں تو بڑی سر دردی ہے بھئی!" اروناشاد، نور باڑی سے باہر آتے ہی اپنے دونوں رجسٹر ایک چبوترے پر رکھ کر ان کے اوپر بیٹھ گئی۔

"ارونا، ابھی تو ہم نے ایک ہی گلی کا سن سس پورا کیا ہے۔ چار گلیاں اور گھوم لوگی تو پھر نہ جانے تمہاری کیا حالت ہو!"

شاما ملہوترا خود بھی اس کام سے کافی بور ہو چکی تھی لیکن وہاں سے بھاگ جانے کی ساری ذمہ داری جیسے اپنی گروپ لیڈر کے سر ڈال دینا چاہتی تھی۔

"میں بھئی آگے نہیں جاؤں گی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ ہاں!" اروناشاد نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

شاما ہنس کر بولی "تو چلو کہیں بیٹھ کر چائے پیئیں۔ تھکن دور ہو جائے گی۔"

"یہاں چائے کہاں ملے گی؟ کوئی ریسٹوران نظر بھی پڑا!" شاہدہ نے اس کی حماقت پر ہنسنا چاہا۔ لیکن اس کے چہرے کی ساخت خوش گوار

چہروں سے بہت مختلف تھی۔

بعض چہرے مغموم اور کھوئے کھوئے ہی رہنے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ شاہدہ ہنس کر بھی ہنستی ہوئی معلوم نہیں ہوئی۔

سن سمس جیسے خشک اور تھکا دینے والے کام کی چھاپ اس کے چہرے پر بھی تھی۔ اپنا رجسٹر بغل میں داب کر سفید ساڑھی کا پلو کمر کے گرد اچھی طرح لپیٹتی ہوئی بڑے اُداس لہجے میں بولی ـــــ "یہاں کوئی ایسا گھر بھی نہیں جہاں ہمیں کوئی مہذب ڈھنگ سے چائے ہی کو پوچھ لیتا!"

"ارے بھئی یہاں تو سب جاہل بستے ہیں۔ سب کے سب جاہل" ارونا شا کا موڈ بھی بگڑنے لگا "یہ لوگ جاہل نہ ہوتے تو ہمیں ایک ایک کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے کاہے کو یہاں آنا پڑتا! بناوٹی مسکراہٹ دکھا دکھا کر ایک ایک سے کیوں پوچھنا پڑتا 'امّاں جی آپ کے کتنے بچے ہیں؟ بیگم صاحبہ آپ کے شوہر کی آمدنی کتنی ہے؟ آپ لوگ اپنے بچوں کو اسکول کیوں نہیں بھیجتے؟ میں تو بھئی امّاں جی، بیگم جی کہتے کہتے پریشان ہو اٹھی ہوں! جب بہتی ہوئی ناک والے میلے، ادھ ننگے بچے میرے ارد گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو بس یہی جی چاہتا ہے اب انہی کے بیچ لیٹ کر پران تیاگ دوں۔ مر جانے کے بعد ایجوکیشن والے شاید شہید کی پدوی دے ہی ڈالیں!"

شاہدہ کام سے اکتائی ہوئی ضرور تھی لیکن اسے اپنے کام کی اہمیت کا بھی احساس تھا۔ لیکن وہ چپ کھڑی تھی اور شاما نے اسے چپ دیکھ کر پوچھا۔ ـــــ "تم کھوئی کھوئی سی کیوں ہو، شاہدہ؟"

"نہیں تو!" وہ چونک کر بولی "میں سوچ رہی ہوں جب ان اندھیرے گھروں میں علم کی روشنی پہنچے گی تو یہ غلیظ اور جاہل بچے کل کلاں بڑے ہو کر

ہماری اس محنت کو بھلا تو نہیں دیں گے ؟ "

" اری شاہدہ! تم کس خوش فہمی میں مبتلا ہو! ہمیں کوئی بھی یاد نہیں کرے گا۔ کوئی پلٹ کر یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کرے گا کہ ہماری جہالت کے آنکڑے جمع کرنے کے لیے کتنی بے کس و مجبور ٹیچرز اسّی اسّی نوّے نوّے کی حقیر تنخواہ کے بدلے ان گلی کوچوں میں ماری ماری پھرتی رہی تھیں! "

شاما ملہوترا جز بز ہو کر بول اٹھی " اب گلی میں کھڑے کھڑے ڈبیٹ کیوں شروع کر دی۔ چاہتی ہو آتے جاتے لوگ بھی جمع ہو کر سنیں ؟ "

وہ تینوں ایک اور گلی میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ لیکن اسی لمحے انھیں کوئی سامنے سے آتا ہوا دکھائی دے گیا۔ وہ ٹھٹھک گئیں۔

" میرا خیال ہے قدیر صاحب آ رہے ہیں " ارونا شاہ نے سائیکل سوار کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

" نہیں جی وہ قدیر صاحب نہیں ہیں۔ چلو چلو "

" ارے وہی تو ہے ناس پیٹا! " اُسے پہچان کر شاہدہ کا رواں رواں سلگ اٹھا۔ " دیکھتی نہیں وہی ہے جو سائیکل کے پیڈلوں تک بڑی مشکل سے پاؤں پہنچا پاتا ہے "

ارونا اور شاما دونوں ہنس پڑیں لیکن انھیں ہنسانے والی شاہدہ خود مغموم صورت بنائے کھڑی رہی۔

ایک پستہ قد نوجوان ان کے قریب پہنچ کر سائیکل سے کود کر نیچے اترا۔ تینوں عورتوں کو بڑے مہذب طریقے سے آداب کیا۔ سب کا باری باری " مزاج بخیر " پوچھا۔ اور پھر جیسے اپنی گھبراہٹ پر پوری طرح قابو پا کر اطمینان سے بولا۔۔۔ " بہن جی سنسس کا کام پورا ہو چکا ؟ "

"اتنی جلدی کیسے ہو جائے گا؟ ہم مشین تھوڑی ہیں!" ارونا شاد نے تڑسے جواب دے مارا۔ اگرچہ قدیر نے سوال بڑی محبت سے پوچھا تھا۔

"میرا مطلب ہے آپ سن سمس میں مصروف ہیں نا!"

"آپ کیا دیکھ رہے ہیں ہم کسی کینٹین میں بیٹھی گپ مار رہی ہیں؟" اب کی ارونا شاد نے بھی بڑی تلخی سے جواب دیا۔ کیوں کہ قدیر شاہدہ کو بڑی محبت سے گھورے جا رہا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ ہماری سی آئی ڈی کرنے نکلے ہیں!" شاما بارہ کے لہجے میں خوشامد تھی۔ وہ مسکرا بھی دی۔ لیکن ہٹلر مارکہ مونچھوں والے قدیر نے خفیف ہو کر اپنی بتیسی نکال دی اور کہا ———

"جی نہیں میں تو ذرا ٹیک ٹرسٹ تک جا رہا تھا۔ پرسوں بچوں کی تعلیمی نمائش ہے نا!"

اگلے چند لمحے کارپوریشن کے پرائمری اسکولوں میں پڑھانے والی استانیاں ہونٹ سی کر کھڑی رہیں۔ جس سے قدیر کو کوئی اور بات چھیڑنے کے بجائے وہاں سے بس کھسکتے ہی بن پڑی۔ کود کر سائیکل کی گدی پر بیٹھتے ہوئے بولا "اچھا آداب عرض!"

وہ ایک دوسرے کی طرف گہری اور معنی خیز نظروں سے دیکھ کر مسکرا دیں۔ شاما بولی: "بیچارا شاہدہ کی محبت میں بری طرح سے مبتلا ہے!"

ارونا نے کہا "وہ شاہدہ کو ہی ایک نظر دیکھ لینے کے لیے ادھر سے نکلا ہے ورنہ ٹیک ٹرسٹ کا سیدھا راستہ تو اُدھر سے نکلتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے ٹیک ٹرسٹ جانے کا بھی ایک بہانہ ہی ہو۔ اگلی گلی سے ہو کر پھر کارپوریشن کو لوٹ جائے۔"

وہ ہنس بھی دیں۔ شاہدہ بھی مسکرائی۔ بولی —— "اُفوہ! تم تو اس طرح اس کی نمائندگی کرنے پر اتر آئیں جیسے اس نے تمھیں رشوت دے رکھی ہے!"

"شاہدہ تم اس کے ساتھ شادی کیوں نہیں کرلیتیں؟ تنخواہ بھی معقول پاتا ہے۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں بھی ہے۔ کبھی کبھی تمھیں ترقی بھی دلا دے گا۔"

شاہدہ نے دونوں کو انگوٹھا دکھا دیا۔ "اب چلو چلو کام ختم بھی کیا جائے۔ نہیں تو رات پڑ جائے گی۔"

تینوں اپنے اپنے رجسٹر سنبھال کر ایک اور گلی میں چلی گئیں۔ ایک دیوار پر لگی پلیٹ کو پڑھنے لگیں۔ "کوچہ چھوٹے نواب صاحب۔"

کارپوریشن کی طرف سے لگائی گئی کالی روغنی پلیٹ کے آس پاس بیشمار نئے و پرانے اشتہارات چسپاں تھے۔ مغلِ اعظم، بیس سال پہلے، ذکرِ رحمتہ العالمین، وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا، مرادیں غریبوں کی بر لانے والا۔

"مکان کا نمبر سی بتیس سو پندرہ ہے نا؟" شاہدہ تم کیا سوچ رہی ہو؟ ذرا پڑھو تو یہ نمبر۔"

"ہاں سی بتیس سو پندرہ ہی تو ہے۔"

"یہاں کون رہتا ہے؟" شاما نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دو منزلہ بوسیدہ مکان کی کھڑکیوں اور دروازوں پر پرانے ٹاٹ لہرا رہے تھے۔

"کہیے کس سے ملنا ہے آپ کو؟" ایک لڑکی نے ٹاٹ کے پیچھے سے بنا دوپٹے کے اپنا آدھا جسم باہر انڈیل دیا۔

"تیرے باپ کا کیا نام ہے لڑکی؟"

"جی؟"

"گھر میں کوئی ہے ؟"

"جی ہاں امی ہیں ۔"

"کوئی مرد تو نہیں ؟"

"جی نہیں ابا کچہری چلے گئے ۔"

"تو ہٹو آگے سے، ہم تمھاری امی سے کچھ پوچھیں گی ۔"

تینوں اس لڑکی کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوئیں ۔ چھوٹے سے صحن میں ایک ادھیڑ عورت اپنا سر کھولے اپنی ایک اور لڑکی سے بالوں میں تیل ڈلوا رہی تھی ۔ گھٹنوں پر رکھی اپنے مرد کی پتلون پہ پیوند بھی لگاتی جاتی تھی ۔

"آپ کے بچے کتنے ہیں بڑی بی !"

اس کے ساتوں بچے ان کے گرد گھیرا ڈال کر بڑی بڑی حیران آنکھوں سے سفید ساڑھیوں میں ملبوس، سیاہ چمکتے ہوئے جوڑوں والی عورتوں کو دیکھنے لگے ۔

"ہم کارپوریشن کے تکشا دبھاگ سے آئی ہیں ۔"

"آپ کے کتنے بچے اسکول جاتے ہیں !"

"صرف شمع اور اکبر کو پڑھا رہی ہوں ۔"

"باقی کو ؟ ۔ آپ کے میاں کیا کرتے ہیں ؟ کتنی تنخواہ پاتے ہیں ؟"

سب بچے ہنسنے لگے ۔ اڑوس پڑوس سے کچھ عورتیں بھی وہاں آگئیں ۔ وہ ضروری باتیں لکھتی ہوئی وہاں سے نکل آئیں ۔ ایک اور مکان کے سامنے کھڑی ہو گئیں جس کے باہر کے حصے میں دکانیں ہی دکانیں بنی ہوئی تھیں ۔ اندر جانے کا راستہ کہیں نظر نہ آیا ۔ نان بائی، قصاب، نائی، پان فروش سبھی سر نکال نکال کر انھیں دیکھنے لگے ۔ انھیں دیکھ کر ایک

پنجابی کپڑا فروش کپڑا ناپنا بھول کر سر کھجانے لگا۔ اس عمارت کا مالک اپنے منشی کو ساتھ لیے ہوئے اپنے کرایہ داروں سے کرایہ وصول کرتا پھرتا تھا۔ جس سے کرایہ نہیں پاتا تھا اُسی کی کھڑے کھڑے توہین کر دیتا تھا۔

ایک موٹر گیرج کا منہ بانس کے ٹٹر سے بند تھا۔ اندر سے صابن ملا ہوا پانی بہہ بہہ کر باہر آرہا تھا۔ دھپا دھپ کپڑے دھونے کی آواز بھی آرہی تھی۔

"ارے بھئی اندر کوئی ہے؟ شاما ملہوترا نے ٹٹر کے سوراخوں میں سے جھانک کر بہت دھیرے سے پوچھا۔ لیکن اسے جواب بہت کڑاکے دار آواز میں ملا۔

"ہاں ہے۔ کیا بات ہے؟" ایک نیم برہنہ تندرست بوڑھی عورت ٹٹر کے پیچھے کولہوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر نمودار ہو گئی۔

"تمہارے میاں کا کیا نام ہے بڑی بی!"

"ہے نہیں ـــ تھا!"

تینوں نے بڑے اچنبھے سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "کیا تھا؟"

"عبدل غفور خاں رام پوری!"

"کچھ دیر چپ رہیں۔ پھر پوچھا گیا۔ "تمہارے بچے کتنے ہیں؟"

"اللہ کا فضل ہے!"

وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ اور کچھ نہ پوچھا اور آگے بڑھ گئیں۔ پیچھے سے بڑھیا نے چلّا کر کہا ـــ "بس! اور کچھ نہیں پوچھو گی؟ کہاں سے کھاتی ہو؟ کس کے سہارے جیتی ہو؟ جیتی بھی ہو یا نہیں؟"

شور سن کر اِدھر اُدھر سے لوگ جمع ہو گئے۔ نان بائی جست کی ایک

ہانڈی میں کڑچھی چلاتے چلاتے کسی اندرونی جذبے سے سرشار ہو کر گا اٹھا: "ابتدائے عشق ہیں ساری رات جاگے ــــ اللہ جانے کیا ہوگا آگے!"

دکانوں کا سلسلہ وہیں پر ختم ہوگیا تھا۔ آگے ایک گرے ہوئے مکان کے ملبے پر لکڑی کا ٹال تھا۔ اس کا مالک ایک سردار تھا جو جسم پر صرف ایک کچھا پہنے لکڑیاں پھاڑ پھاڑ کر ایک طرف پھینک رہا تھا۔ اس کی سردارنی لکڑی کے تختے پر بیٹھی بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ وہ اس کے پاس پہنچ کر پوچھنے لگیں۔

"تم یہاں رہتی ہو؟ اسی ٹال پر!" شاملہوترا کو ایک کونے میں لکڑی کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا کمرہ دکھائی دیا جس کی چھت پر کپڑے سوکھ رہے تھے۔

"ہور کتھے رہنا جی؟" سردارنی بچے کا رخ بدل کر دوسری طرف سے دودھ پلانے لگی۔ اور پڑوس کے ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ـــ "سرکار نے کلیم وچ ایہہ مکان الاٹ نا[illegible] ہندا اے۔ پر بڈھا نڑے مسلماں خالی ہی کرن نا!"

"اچھا تمھارے بچے کتنے ہیں؟"

"پنج"

"پڑھتے ہیں؟"

"نئیں۔ اک اُس سامنے چوراہے تے سیکلاں دی مرمت کردا اے۔ دوسرا اپنے چاچے نال پھیری تے کپڑا ویچن جاندا اے۔ تیسرا بالکل لنگڑا اپاہج اے۔ تے۔ باقی دوا جے چھوٹے نے۔"

"انھیں تم پڑھاتی کیوں نہیں؟"

"کی کراں جی پڑھا کے؟ فیساں بھرن دی طاقت نئیں۔"

سردار نے کلہاڑے کو ایک لکڑی کے سینے میں ایک ہی ضرب سے

پھنسا کر چھوڑ دیا۔ اور ان کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے کالے کلوٹے بدن پر پسینے کی نالیاں چل رہی تھیں۔ وہ لمبے لمبے سانس لیتا ہوا ان کی طرف لال لال آنکھوں سے گھورنے لگا۔ اُستانیاں گھبرا کر ملبے سے اُتر آئیں۔ گلی میں آکر دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ نوابی عہد کی لکھوری اینٹوں والے مکانات اب خستہ ہو چلے تھے۔ ایک دیوار پر بیلوں کی جوڑی بنی ہوئی تھی۔ اس کے آگے گیہوں کی بالی اور درانتی کا نقش تھا۔ اس کے آگے جھونپڑی، ہاتھی، سائیکل، اور اس طرح کئی علامتوں کا سلسلہ تھا۔ وہ چلتے چلتے ایک مکان کے سامنے رک گئیں۔ وہ مکان بھی کافی پُرانا تھا۔ اس کے درودیوار کانپتے ہوئے سے لگتے تھے۔ جا بجا اینٹیں اور کڑیاں نکلی ہوئیں جیسے کسی انسانی جسم کا گلا سڑا ڈھانچہ ہوتا ہے۔ اینٹوں کے بیچ میں سے جا بجا مٹی چونا مصالحہ سبھی کچھ نکل چکا تھا۔ وہاں ان کا سواگت ایک بکری کے بچے نے ممیا کر کیا۔

"یہاں کون رہتا ہے؟" جیسے انھوں نے بند دروازے سے پوچھنا چاہا لیکن بند دروازہ خاموش ہی رہا۔ بند ہی رہا۔ تین چار بار کھٹکھٹانے پر اندر سے کنڈی کھولی گئی۔ کنڈی کھولنے والا چھ سال کا ایک بچہ تھا جو ایک خالی پیٹی پر چڑھا ہوا نظر آیا۔

"گھر میں کون ہے؟"

"امّاں۔"

"چلو ہٹو۔ یہ پیٹی بھی ہٹالو۔"

لڑکے کے جسم پر کھلے گریبان کی صرف قمیص ہی تھی۔ اُس کے ہاتھوں، پیروں اور ٹانگوں پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ گال پر ناک بہتے بہتے سوکھ چکی تھی۔ انھیں بڑی گھن آئی۔

صحن کافی کشادہ تھا۔ کئی کمرے دکھائی پڑے، لیکن سب خالی، ویران

اور گرے پڑے سے۔ ایک آر پار بندھی ہوئی رسّی پر رنگ دار تہمد اور تولیے سوکھ رہے تھے۔ برآمدے کے فرش پر جھوٹے برتنوں کا ایک ڈھیر لگ گیا تھا۔

کمرے میں ایک چارپائی پر ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی اس کے پاس دوسری چارپائی پر ایک لڑکی لیٹی تھی تیسری چارپائی پر دو اور بچّے لیٹے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی وہ سمجھ گئیں سب بیمار ہیں ان کی آہٹ پا کر عورت نے آنکھیں کھول دیں۔ لیٹے لیٹے ہی انھیں غور سے دیکھا۔

"آپ کو کیا ہوا؟ بخار؟ یہ بچّے بھی بیمار ہیں کیا؟" ارونا شاہ نے اس کے پاس بیٹھ کر ہمدردی جتائی۔ شاہدہ کی نظریں دیوار پر جمی تھیں۔ جہاں آڑی ترچھی تصویریں اور گھٹیا قسم کے کیلنڈر لٹکے ہوئے تھے۔ جس لڑکے نے دروازہ کھولا تھا وہ اپنی ماں کے پاس کھڑا ہو کر منہ میں قمیص کا کونا دبائے ان سب کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہم سرکار کی طرف سے گھر گھر جا کر لوگوں کی آمدنی، ان کے بچّوں کی تعداد اور تعلیم کے بارے میں ٹھیک ٹھیک جان کاری حاصل کرتی پھرتی ہیں۔" شاما ملہوترا نے اپنے آنے کی غرض و غایت بتادی۔

ارونا بولی ــــــ "لیکن آپ تو بیمار ہیں!"

اس عورت نے گردن گھما کر اپنے لڑکے کو پکارا۔ "اے رفّنو! ذرا پانی لادے۔ حلق سوکھ رہا ہے۔"

لڑکا پانی لے کر آگیا۔ وہ پانی پی چکی تو قدرے اونچی آواز میں بولی "کیا پوچھنا ہے؟"

تینوں بُت سی بنی ہوئی تھیں۔ شاہدہ پہلے سے زیادہ سمجھ گئی تھی۔

"آپ کے خاوند کا نام ؟"

"سعید احمد صدیقی۔"

"کیا کرتے ہیں ؟"

"گھر سے باہر کلرکی۔ گھر کے اندر مار پیٹ گالی گلوچ۔"

"شاہدہ اس کا ماتھا چھو کر پہلی بار بولی ۔۔۔"آپ کو بہت تیز بخار ہے۔ آرام کیجیے ہم اور کچھ نہیں پوچھیں گی۔"

"نہیں نہیں پوچھیے۔ مجھے بخار نہیں آیا ہوتا تب بھی میں آپ کو یہی بتاتی۔ اس گھر میں سچ مچ یہی ہوتا ہے۔ وہ روزانہ شراب پی کر لوٹتے ہیں ہم روزانہ ان کے ہاتھوں پٹتے ہیں گالیاں کھاتے ہیں۔"

"تنخواہ کتنی پاتے ہیں ؟"

"سنتی ہوں دو سو پا لیتے ہیں لیکن میرے ہاتھ پر ساٹھ ستر ہی رکھتے ہیں۔ اس میں مجھے سارے مہینے کا خرچ چلانا پڑتا ہے۔"

"یہی چار بچے ہیں ؟"

اس عورت نے شاما کی طرف بڑی حیرت سے دیکھا۔ جیسے اس نے بہت ہی عجیب سوال پوچھا ہو۔ پھر دھیرے سے بولی۔"جی ہاں، یہی چار ہیں اور میری جان کھانے کے لیے بہت ہی کافی۔ اس وقت بیمار نہ پڑے ہوتے تو ایسا اودھم مچا رہے ہوتے کہ آپ کے لیے یہاں دو منٹ بھی ٹھہرنا دشوار ہو جاتا۔"

"سب پڑھتے ہیں نا"

"جی نہیں پہلے پڑھتے تھے۔ اب نہیں۔ فیس اور کتابوں کی قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ نہیں دے سکتی تھی اس لیے اٹھا لیا۔"

انھوں نے اور کچھ نہ پوچھا۔ شکریہ ادا کر کے باہر آگئیں۔

ارونا بولی ——— "بعض عورتیں بڑی شکایتی ٹٹو ہوتی ہیں۔ ہر وقت اپنے آدمی کی شکایت لیے رہتی ہیں۔"

"میرا خیال ہے اپنے آدمیوں کو بگاڑنے والی بھی یہی عورتیں ہوتی ہیں۔" شاما نے شاہدہ کا کندھا چھو کر کہا ——— "کیوں شاہدہ ؟"

ارونا ہنس کر بولی "——— اس سے کیا پوچھتی ہو ؟"

شاہدہ نے ان کی طرف افسردگی سے دیکھا اور پوچھا ——— "اچھا بھئی اب آگے بڑھو۔"

ارونا اور شاما نے گھر جانے کی ٹھان لی۔ دونو ایک ہی محلے میں رہتی تھیں۔ وہ ایک رکشا لے کر چل دیں۔ شاہدہ کا مکان قصائی باڑے میں تھا۔ لیکن وہ ادھر جانے کے بجائے اسی مکان کی طرف لوٹ گئی۔ جس میں وہ آخر میں گئی تھی۔

بیمار عورت نے شاہدہ کے لوٹ آنے پر حیرانی ظاہر کی۔ شاہدہ اس کے پاس بیٹھ کر بولی "آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے۔ کھانا بنا دوں ؟ دوا لادوں ؟ بتایئے ! آپ کس ڈاکٹر کا علاج کرا رہی ہیں ؟"

اس عورت کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ تکیے کے نیچے سے نسخے نکال کر اس کے حوالے کرتی ہوئی بولی "ان سے صبح کہا تھا آج دفتر نہ جایئے۔ چھٹی لے لیجیے۔ لیکن وہ سنی ان سنی کر کے چل دیے۔"

شاہدہ اس کے لڑکے رفیق کو ساتھ لے جا کر ڈاکٹر کے پاس گئی۔ دوا لے آکر سب کو ایک ایک خوراک پلادی۔ پھر ان سب کا کھانا بنایا۔ رفیق کو نل کے نیچے لے جا کر مل مل کر نہلایا۔ اس کے کپڑے بدلے۔ ان کے دو چار میلے کپڑے

بھی بھگو کر نچوڑ دیے۔ اس کے بعد کمرے اور برآمدے میں جھاڑو لگا دی۔ یہاں وہاں گری پڑی کو سمیٹ دیا۔ میزوں پر رکھی ہوئی کتابوں اور دوا کی شیشیوں کو ترتیب سے رکھ دیا۔ دیواروں پر ٹنگی ہوئی تصویروں کو بھی پونچھ ڈالا۔ اس سے گھر کا نقشہ ہی جیسے بدل گیا۔ جیسے کوئی روتے روتے اچانک مسکرا دے۔

شاہدہ نے چاہا جانے سے پہلے اس عورت کے بالوں میں تیل بھی لگا دے انھیں سنوار دے۔ وہ کئی روز سے روکھے بال لیے پڑی تھی۔ لیکن اس عورت نے اسے روک دیا۔ کہا۔ "بس بہن۔ اب اور تکلیف نہ کرو۔ تم نے بہت کچھ کر دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تمھارا شکریہ کس زبان سے ادا کروں! ایک بات پوچھوں؟ پتہ نہیں یہ بات میرے دل میں کیوں آ گئی ہے! شاید میرا قیافہ صحیح ہی نکلے۔ تمھارا نام شاہدہ تو نہیں!"

اپنا نام سن کر شاہدہ ہکا بکا رہ گئی۔

اس کے ہاتھ پیر کانپنے سے لگے۔ وہ عورت اسے گھور گھور کر دیکھتی رہی۔ شاہدہ اس کے ساتھ آنکھیں تک نہیں ملا پا رہی تھی۔

اس عورت نے نقاہت سے آنکھیں بند کر لیں۔ کہنے لگی۔ "جب تم ان کی تصویر پوچھ رہی تھیں تبھی میں نے سمجھ لیا تھا۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے جس سے محبت کی تھی اسی کے ساتھ شادی کیوں نہ کی؟ میری زندگی کو دوزخ کیوں بنا دیا؟"

بیمار عورت آنکھیں بند کیے کیے ہی بولتی رہی۔ شاہدہ سے کچھ اور نہ سنا گیا۔ ساڑھی کے پلّو سے آنکھوں کے کونے پونچھتی ہوئی آہستہ آہستہ قدموں کے ساتھ باہر نکل آئی۔

مائی ڈیر سویتا

مائی ڈیر سویتا۔۔۔۔

ہمیں شادی کیے سولہ برس گزر گئے ہیں۔ اور اس عرصہ میں میں نے تمھیں ان گنت خطوط لکھے ہیں۔ اتنے خطوط کہ جن سے کئی صندوق بھرے جا سکتے ہیں۔ ایسے خطوط لکھ کر میں ہمیشہ محظوظ ہوتا تھا۔ تم کتنی مرتبہ ہندوستان سے باہر گئیں روس چین، انڈونیشیا، سیام، امریکہ۔۔۔۔ جب ہندوستان اور پاکستان کو آزادی ملی تھی۔ اور آزادی کے فسادات میں سرحد کے دونوں طرف ہزاروں عورتیں اغوا کر لی گئی تھیں تو تم اُن مغویہ عورتوں کی بحالی کا مشن لے کر پاکستان گئی تھیں۔ میں جب بھی تمھیں والہانہ محبت سے خطوط لکھتا رہا۔ اور ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ تم انڈو چائنا دوستی لیگ کی طرف سے چین کے جشنِ آزادی میں شرکت کرنے گئی تھیں۔ میں تمھیں ہر روز یہاں سے ایک خط لکھتا تھا۔ اور تم جب عام انتخابات کے دورے کے لیے نگر نگر، گاؤں گاؤں اپنی اپنی پارٹی کا پروپیگنڈہ

کرنے کے لیے گھومتی پھرتی تھیں، جب بھی میں اپنی اس "بانی" کو روک نہ سکا۔ خط لکھنا میرا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ ان خطوں ہی کی بدولت تو ہم تم ایک، دوسرے کو اتنا قریب محسوس کرتے رہے ہیں۔ لیکن آج یہ خط جو تمھیں لکھ رہا ہوں شغل کے طور پر نہیں ہے اور نہ ہی مجھے کوئی حظ حاصل ہو رہا ہے۔

ہمارے سامنے ایک الجھن پیدا ہو گئی ہے۔ جس کے پیدا کرنے کا ذمہ دار میں ہوں۔ تم بلیا کے ضمنی انتخابات سے فارغ ہو کر آئندہ ہفتے گھر آجاؤ گی۔ میں تمھارا انتظار کروں گا۔ اگرچہ میں ہی پورے طور پر ذمہ دار ہوں۔ اور سارا الزام مجھ ہی پر آتا ہے۔ لیکن اسے تم ہی سلجھا سکو گی۔ تم اسے نظر انداز نہیں کرو گی، مجھے اس بات کا یقین ہے اس لیے رات کے بارہ بجے بیٹھا تمھیں لکھ رہا ہوں۔ بارہ سے اوپر ہو چکے ہیں۔ کافی کا آدھا پیالہ میرے سامنے میز پر رکھا ہوا ہے۔ چار پیالے پہلے پی چکا ہوں۔

یہ آج کا واقعہ ہے۔ آج رات کا۔ دراصل یہ واقعہ کل سے ہونا شروع ہوا تھا۔ میرا جی تو چاہا تھا کہ تمھیں ٹرنک کال کر کے مطلع کر دوں لیکن پھر سوچا، پتہ نہیں تم کسی جی کے یہاں ٹھہری ہو یا پارٹی کے دفتر میں۔ اور پھر اس وقت جب کہ تم دن بھر ووٹروں کے سامنے تقریریں کر کے تھک کر سو چکی ہو گی، جگانا اچھا نہیں ہو گا۔ اس لیے میں نے یہ خط لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسرے میں اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ مجھے اس بات کا شبہ ہو گیا۔ ممکن ہے تم اتنی دور سے ٹیلیفون پر میری گھبراہٹ کا اندازہ نہ کر سکو۔ ٹیلیفون پر تو مجھے بہت مختصر سی گفتگو کرنی پڑتی اور خط میں تمھیں اس واقعہ کی پوری روئداد سنا سکتا ہوں۔ اور یہ واقعہ چاہتا بھی ہے کہ اسے پوری تفصیل سے بیان کیا جائے۔ تاکہ میں تمھاری ہمدردی اور یہ یقین حاصل کر سکوں کہ تم واقعہ کی نوعیت کو غلط نہیں سمجھو گی۔

تمھیں یاد ہے میرے ساتھ یونی ورسٹی میں ایک پروفیسر گپتا بھی ہیں، جو پالیٹکس پڑھاتے ہیں۔ انھوں نے چند برس ہوئے روہنی سے لو میرج کی تھی جو بہت تھوڑے عرصہ بعد کسی وجہ سے کرائسس میں پڑ گئی اور نوبت ایک ٹھنڈی خاموشی تک جا پہنچی۔ روہنی کو بھی تم جانتی ہوگی۔ دو تین مرتبہ تم سے اس کی ملاقات ہو چکی ہے۔ روہنی آج کل اپنے باپ کے گھر رہتی ہے۔ اس نے پھر پڑھنا شروع کر دیا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس نے پالیٹکس کا مضمون لے رکھا ہے اور گپتا جی سے پڑھتی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ میں گپتا جی سے زیادہ روہنی کو جانتا ہوں۔ ان کی شادی اور ٹھنڈی خاموشی سے بھی بہت پہلے جب میں نے ایم اے کیا ہی تھا اور یونی ورسٹی میں لیکچرار ہو گیا تھا اُن دنوں روہنی سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت روہنی اب کی طرح بے باک اور شوخ نہیں تھی بلکہ ایک نہایت شرمیلی لڑکی تھی۔ میں نے تمھیں یہ بات بتائی تو تھی کہ جب تمھارے ساتھ میرا میل جول بڑھ گیا تو میں روہنی کو بالکل بھول گیا۔ اور روہنی نے اس حادثے کو بجا طور پر محسوس کیا تھا۔ کیا تم اس روہنی کو یاد کر سکتی ہو۔ میرا خیال ہے اس وقت تمھاری آنکھوں کے سامنے اونچے قد کی چھریرے بدن اور انگریزی فیشن کے ترشے ہوئے بالوں والی روہنی کی صورت گھومنے لگی ہوگی۔ ممکن ہے ٹھیک طرح سے یاد بھی نہ آ رہی ہو کیوں کہ تم کو پارٹی کے کام سے فرصت ہی بہت کم ملتی ہے اور جب ملتی ہے تو تم اپنی دنیا سے الگ قسم کے لوگوں سے بہت زیادہ دل چسپی کے ساتھ نہیں ملتی ہو۔

ہاں تو، آج اسی روہنی کی وجہ سے ایک حادثہ ہو گیا۔ آج نہیں، کل۔ تم پورا قصہ سن لو۔ کل میں ایسٹرن بک شاپ میں سڑک کے قانون پر ایک نئی کتاب ڈھونڈنے گیا تھا۔ مجھے وہاں گھستے دیکھ کر روہنی بھی پیچھے پیچھے چلی آئی۔ اس

وقت وہ حضرت گنج سے آرہی تھی۔ ہماری آپس میں باتیں ہونے لگیں۔ بالکل ایسے
جیسے عام لوگ ملتے وقت کیا کرتے ہیں۔ اس نے تمہارے بارے میں پوچھا۔ میں نے
بتادیا کہ تم آج کل بلیا کے ایک ضمنی انتخاب کے سلسلے میں پروپیگنڈہ ٹور پر ہو۔ اس
نے مکند کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ میں نے اُسے مکند کے بارے میں بھی بتادیا
کہ وہ کل اسکول کے ٹیچروں اور لڑکوں کے ساتھ رائے بریلی کے قریب ایک
مہم میں حصہ لینے گیا ہوا ہے۔ یہ سب بات چیت جو مجھے گھر پر اکیلا ظاہر کرتی تھی۔
میں نے اپنے طور پر نہیں کی تھی۔ سچ مانو۔ بالکل اس کے پوچھنے پر ہوئی۔ تمہیں
معلوم ہے، میں اس قسم کا شوہر نہیں ہوں کہ بیوی کی غیر حاضری کا فائدہ
اٹھانے کے لیے رومان لڑاتا پھروں۔ تم تو مجھے جانتی ہو۔ تم سے الگ رہتے
ہوئے ایک مدت بیت گئی ہے لیکن آج تک ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا ہے
جو میرے اور تمہارے دل میں بدگمانی پیدا کرسکنے کا باعث بنا ہو۔ میں روہنی
سے ایسے باتیں کرتا رہا جیسے اس کے منہ سے نکلے ہوئے سوال بالکل ایک عام
آدمی کے سوال تھے۔ اور میرے لیے ذرا اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

"مکند اب بارہ تیرہ برس کا ہوگا؟"

روہنی نے پوچھا۔

"کیا؟ ـــ کیوں ـــ وہ اب پندرہ برس کا ہے۔ دسویں جماعت
میں تعلیم پا رہا ہے۔"

تم جانتی ہو کہ میں مکند کے پندرہ برس کا ہو جانے پر کتنا فخر محسوس
کرتا ہوں۔ میرا اور تمہارا ایک ہی تو لڑکا ہے۔ جس سے ہماری بہت سی توقعات
وابستہ ہیں۔

"لیکن تمہارا لڑکا اتنا بڑا کیسے ہو گیا؟ تعجب ہے!"

روہنی نے کہا۔ اور مجھے اس کی پیدائش کی تاریخ بتا کر ثابت کرنا پڑا۔ اس وقت میرے پرس میں مکند کا ایک فوٹوگراف پڑا تھا جسے ایک مہینہ پہلے تمہارے ایک بنگالی ساتھی نے ہمارے گھر میں لیا تھا۔ اسے دیکھ کر روہنی بولی ــــ

"یہ تو تم ہو!"

"ہاں جی! آج سے بیس برس پہلے کا۔"

میں ہنس پڑا۔ ایسٹرن شاپ سیلز مین بھی مسکرا دیا۔ وہ بھی ہماری باتیں سُن رہا تھا۔ دیکھا تم نے ہم نے سرگوشی کا انداز اختیار نہیں کیا۔ ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ ہم محض کھڑے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ زیادہ تر مکند کے بارے میں۔ میں پھر دوسری کتابیں دیکھنے میں محو ہو گیا۔ روہنی کی موجودگی کو کسی حد تک، بھول گیا تھا۔ جب میں اپنی مطلوبہ کتاب لے چکا تو روہنی سے اجازت چاہی۔ لیکن اس نے کہا ــــ

"میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔"

ہم دوکان سے باہر چلے آئے۔ روہنی اور میں اور ہمارا بھورے رنگ کا موتی!

مجھے کچھ شاپنگ کرنا تھی اور موتی کو ہر بجلی کے پول کے پاس رک کر ادھر اُدھر گھورنا تھا۔ روہنی ہمارے پروگرام میں مخل ہو رہی تھی۔ لیکن ہم اس سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔ جب ہم ہلواسیہ مارکیٹ میں پہنچے تو میں نے قدم آہستہ کر دیئے اور اس سے کہا ــــ

"مجھے یہاں رُکنا ہے۔"

"کوئی بات نہیں!"

اس نے کہا اور ساتھ ساتھ گھوم آئی۔ مارکیٹ میں اُسے ساتھ لے کر

مجھے کچھ الجھن سی ہونے لگی۔ تم جانتی ہو میں کوئی چیز خریدنے اور اس کے دام دینے کے بارے میں کتنا محتاط ہوں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جیسا کہ عموماً دوکاندار زیادہ دام مانگتے ہیں، میں محض روہنی کی وجہ سے زیادہ دام دیتا چلا جاتا۔ میں نے اوور کوٹ کے لیے ایک کپڑا دیکھا اور زیادہ دام سن کر لینے سے انکار کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ روہنی میرے اس انکار یا سودے کی بات چیت کی طرف متوجہ ہوتی۔ میں نے جب اس کی طرف دیکھا تو یوں محسوس کیا جیسے اس نے میرے رویئے کو قبول کیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔۔۔۔۔

"میں یہی دیکھنا چاہتی تھی کہ آپ اپنی ضروریات کو کیسے خریدتے ہیں۔ بیشتر آدمی کپڑے یا کسی دوسری چیز کی پہلی جھلک پر مرمٹتے ہیں اور فوراً خرید کر لے جاتے ہیں۔ پھر بعد میں پچھتاتے ہیں۔ اپنی چیزوں کی خرید میں بالکل کاروباری بن جانا چاہیئے۔ جیسے دفتر کو چلایا جاتا ہے۔ عملی دانشمندی اسی کا نام ہے۔"

روہنی کے اس ریمارک نے میرے اندر کی کچھ بیزاری چھین لی جو اس کے لیے پیدا ہو چکی تھی۔ ایک غیر متوقع تعریف ایک عام انسان کے لیے کچھ نہ کچھ تو اثر رکھتی ہے نا۔

میں جب مارکیٹ سے باہر آیا تو میں نے موتی کے بھورے رنگ کے لمبے لمبے بالوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر زور سے کھینچا اور پھر اس کی پیٹھ کو تھپتھپاتے وقت اپنے ہاتھوں کو غیر معمولی طور پر سخت کر لیا۔ موتی نے میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھا۔ جیسے میری حرکتوں سے میری بے وقوفی کا مظاہرہ ہو رہا ہو۔

روہنی نے مجھے اپنی کار میں چلنے کی پیش کش کی۔ لیکن میں اپنی کار پر آیا تھا اور جسے میں نے فیر کے سامنے پارک کیا تھا۔ وہاں تک وہ میرے ساتھ ساتھ چلی آئی۔

"تم آج رات کو میرے ساتھ کھانا کھاؤ تو کیسا رہے گا؟"
اس نے اچانک پوچھا۔
میں حیران رہ گیا۔ اسے گھورنے لگا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔
"کیوں نہیں ہو سکتا؟"
اس کا سوال کتنا احمقانہ تھا جس کا جواب قدرتی طور پر نہیں تھا۔ کیونکہ میں شادی شدہ تھا اور اس کی ازدواجی زندگی ابھی تک کرائسس میں تھی۔
میں نے اس سے پھر کہا ـــــ
"یہ ہو نہیں سکتا۔ کم از کم......"
وہ ہنس پڑی، بولی ـــــ
"یہ کوئی جواب نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تم اسے قبول کر سکتے ہو۔ اور یہ بالکل معقول بات ہے۔ تم بھی آج کل اکیلے ہو اور میں بھی۔"
وہ بھلے ہی اکیلی تھی۔ مجھے اس سے کیا۔ جہاں تک میری تنہائی کا تعلق تھا میں نے سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچا نہیں تھا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور جب تم مجھ سے دور ہوتی ہو میں مضطرب رہتا ہوں۔ لیکن اپنے آپ کو مشغول رکھتا ہوں۔ دن بھر یونیورسٹی اور گھر پر کتابیں۔ میرے لیے یہی کافی ہوتا ہے۔
"تمہیں آنا پڑے گا۔"
روشنی نے کہا۔
میں نے سر ہلا دیا ـــــ "نہیں روشنی میں سچ مچ نہیں آ سکتا۔"
"اچھی بات ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اتنی دیر تک تمہارے پیچھے گھومتی رہی۔"

میں نے کہا۔۔

"ایسا مت سوچو روہنی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میری بیوی سویتا یہاں نہیں ہے اور پھر تمھاری زندگی کا کرائسس بھی ابھی نہیں ٹلا۔ تمھارے ہاں میرا اس طرح آنا بہت سے شبہات پیدا کر سکتا ہے۔"

وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ میں خوش تھا کہ وہ میری بات پر ہنس نہیں دی۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ اس نے ایسا کیوں نہ کیا۔ وہ ہنس دی ہوتی تو میں سیدھے گھر چلا آیا ہوتا۔ اور اس وقت مزے سے گہری نیند سویا ہوا ہوتا۔ اس وقت تک جاگ کر تمھیں خط نہ لکھ رہا ہوتا۔ لیکن وہ ہنسی نہیں۔ اور مجھے شبہ ہوا کہ شاید اُسے میرا انکار سخت ناگوار گزرا ہے۔ اس لیے میں نے پھر کہا۔۔۔

"روہنی میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ لوگ اپنے طور پر کچھ غلط سمجھ بیٹھیں گے۔"

لیکن میں اُسے مطمئن نہ کر سکا۔ جب تک کہ اور تھوڑی دیر اس بارے میں باتیں کرنے کے بعد میں نے اس کی دعوت قبول نہ کر لی۔ تب مجھے اپنا انکار اور بہانہ بہت فضول اور بے وزن معلوم ہونے لگا۔ آخر اس کی دعوت قبول کر لینے میں حرج ہی کیا تھا۔ میں بھی ہنس پڑا۔ اپنی حماقت پر۔ اپنی تنگ نظری پر۔ اور وہم اور احساسِ کمتری کی ان دیواروں پر جن کے اندر میں نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو مقید کر رکھا تھا۔ میں جیسے ایک گناہ کے تصور سے بچنے کے لیے ایک دوسرا گناہ کر رہا تھا۔ جھوٹ بولنے کا گناہ اور سب سے بڑھ کر ایک خوب صورت عورت کا دل توڑنے کا گناہ۔ جسے میں نے کبھی پیار سے دیکھا تھا اور دل میں ایک کشش محسوس کی تھی۔ خیر یہ بات تو بالکل دوسری ہے۔ میں تمھیں یہ بتا رہا تھا کہ میں نے اس کی دعوت قبول کر کے محسوس کیا، کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ تم یہاں ہوتیں اور کسی وجہ سے میرا ساتھ نہ دے سکتیں تو مجھے بھی

مشورہ دیتیں۔ اور اب بھی میں پُرامید ہوں کہ تم میرے اقدام کو سراہو گی۔ کہ وہ شام اکیلا گھر پر پڑے پڑے بور ہونے کے۔ بجائے ایک اچھی عورت کے ہاں چلا گیا۔ میں نے وہاں جانے میں یکایک اپنے اندر جیسی خوشی محسوس کی اس کا احساس تمھیں بھی خوش ہونے پر مجبور کرے گا۔ آخر تم روہنی سے کسی قسم کا حسد تو نہیں کرتی ہو۔

کچھ دیر بعد جب میں نے اپنے آپ کو پورے طور پر حق بجانب سمجھ لیا تو اس بارے میں مزید گفتگو بند کر دی۔ روہنی نے صرف اتنا کہا" سات بجے آکر تمھیں ساتھ لے جاؤں گی۔ ٹھیک ۔۔۔۔ ؟"

"ہاں!" میں نے کہہ دیا۔

میں گھر جا کر سوچنے لگا ۔۔۔ آج شام کو کیا پہنوں گا؟ میرے اندر اب روہنی کے ساتھ جانے میں کوئی جھجک نہیں تھی۔ اب صرف مجھے اپنے کپڑوں کا انتخاب کرنا تھا۔ ادھر کتنے عرصے سے میں نے سوٹ نہیں پہنا تھا۔ شیروانی پاجامہ، جواہر جیکٹ، کرتہ اور دھوتی۔ میں خوشی کی ان لہروں کو بھی کھو چکا تھا جو ایک اچھا سلا ہوا اور قیمتی سوٹ پہننے سے جسم کے انگ انگ میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ کہنے سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ایک بار پھر دیسی لباس چھوڑ کر ولایتی لباس کی حمایت کرنے لگا ہوں۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ کسی خاص قسم کے لباس پر قائم رہنا اور پھر بلا وجہ دوسری قسم کے لباس میں سے نقص چننا اچھے ذوق کی نشانی نہیں ہے۔ میں تو اسے تعصّب ہی کہوں گا۔ لباس کا تعصّب۔ جس کا رشتہ علاقے سے بڑھ کر مذہب سے جا ملتا ہے اور پھر انسان ایک دوسرے سے اس طرح جدا ہونے کی کوشش میں مصروف نظر آنے لگتے ہیں جیسے خالق انھیں شکل وصورت کے لحاظ سے ایک جیسا بنا کر سخت غلطی کر بیٹھا ہو اور انسان

اس غلطی کا انتقام ایک دوسرے سے لے رہے ہوں۔ مشرق اور مغرب بن کر، شمال اور جنوب بن کر، ٹوپی بن کر، ہیٹ بن کر، پتلون بن کر، دھوتی بن کر۔

تم بھی کہو گی میں نے مذہب اور لباس کی تفریق پر ایک خاصا لیکچر دے ڈالا۔ ہاں بات تو شام کے لباس کے انتخاب سے چلی تھی۔ میں جوں جوں لباس کے بارے میں سوچتا گیا میرے اندر ایک کھلبلی مچتی گئی۔ ایک بات تم اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ مجھے ردھنی سے ذہنی طور پر کوئی لگاؤ نہیں تھا اور نہ ہی میرے دل میں کئی برس پہلے کی سوئی ہوئی محبت جاگ اٹھی تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ میں آج معمول کے خلاف ایک نئی بات کر رہا تھا۔ کئی برس کے پرانے معمول کو توڑ کر۔ اس میں ردھنی کی ذات کو ذرا دخل نہ تھا۔ میں نے اس کے بارے میں زیادہ سوچا ہی نہ تھا۔ میرے ذہن میں ایک عجیب بے آواز سی گھنٹیوں کی گونج جمع ہو گئی تھی جیسے گھنٹی بج چکنے کے بعد کی تھرتھراہٹ ہو۔ جیسے کسی کے ڈوب جانے کے بعد پانی کی سطح پر پھیلتی ہوئی لہروں کے دائرے ہوں۔ چلو اس بات کا تو میں اقرار کیے لیتا ہوں کہ میرے ان احساسات کی محرک ردھنی ہی تھی۔ کل کی ردھنی نہیں، کئی برس پہلے کی ردھنی!

میں نے اپنا وہ سوٹ نکال کر پہنا جو پچھلے سال تمھارے چین جانے کے بعد سلوایا تھا۔ اور جسے پہن کر اس سال یونی ورسٹی کی کنووکیشن میں شامل ہوا تھا کل جس وقت میں سوٹ کو پریس کرانے کے بعد پہن کر آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو میں نے اپنے جسم کے اندر ایک برقی رو محسوس کی۔ میں جیسے کئی برس پہلے چلا گیا۔ جوان اور خوب صورت و شوخ۔ میں اپنی تعریف نہیں کر رہا ہوں۔ یہ تو اس شخص کی تعریف کر رہا ہوں جو مجھے اس آئینے میں دکھائی دیا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس روز پہلی مرتبہ میرے دماغ میں یہ بات

آئی کہ جو لوگ ہمیشہ دائیں بائیں آئینے میں گھورنے کے عادی ہیں اور نفسیاتی طور پر اپنے عاشق کہلاتے ہیں، کتنے سچے ہوتے ہیں۔ میں نے چاکلیٹ کلر کے سوٹ کے ساتھ گہرے سرخ رنگ کی سفید دھبّوں والی بو باندھی اور بالوں کو بہت احتیاط سے برش کرنے لگا۔ برش کرتے کرتے میں نے بیچ میں ماتھے پر بالوں کو لہرانے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس وقت میرے ذہن میں مکند آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ بھی تو بالکل اسی طرح بالوں کو بنایا کرتا ہے۔ جانے وہ کس ایکٹر کی نقل کرتا ہے۔ میں تو اپنے بیٹے کی نقل کر رہا تھا۔ اسی طرح موڈی بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس طرح واقعی میں نوجوان اور جاذب معلوم ہونے لگا تھا۔ یہ باتیں میں کتنی صفائی سے تمھیں لکھ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے تم انھیں پڑھ کر مجھے بے وقوف اور جذباتی نہیں سمجھ رہی ہوگی۔ بلکہ اصل واقعہ کی نوعیت جاننے کے لیے بے چین ہو اٹھی ہوگی۔

روہنی سات بجنے سے چند منٹ پہلے پہنچ گئی۔ اس کی سفید پیکارڈ کا ہارن سن کر میں باہر نکل آیا۔ اور میں نے بجا طور پر محسوس کیا کہ روہنی نے میری طرف بہت ہی حیرت سے دیکھا تھا۔ وہ کار سے باہر نکلی تو مجھے گھورتی ہی رہ گئی۔ مجھے یہ شک ہوا کہ شاید میں بالکل بے وقوف معلوم ہو رہا ہوں اور وہ مجھے ساتھ لے جانے سے انکار کر دے گی۔ جیسے ایک مرتبہ فوڈ منسٹر کے ڈنر میں تم نے مجھے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ کیوں کہ اس ڈنر میں میں نے ریشمین چھینٹ کی پکنک شرٹ پہن رکھی تھی اور تم بضد تھیں کہ یا تو اسے بدل کر کھدر کی شیروانی اور پاجامہ پہن لوں۔۔ یا پھر تمھارے ساتھ جاؤں ہی نہیں۔ میں نے دوسری تجویز کو منظور کر لیا تھا۔ اگرچہ اس واقعے کے بعد تم نے کسی حد تک اپنے اور میرے درمیان ایک ذہنی کشمکش کے پیدا ہو جانے کے امکانات ظاہر کیے تھے۔ لیکن میں نے اس بات کو تمھارے خیالات کی ایک روش ہی کا نام دیا تھا۔ میں نے تمھیں

یقین دلانے کے لیے کتنی مرتبہ کہا تھا کہ میں کبھی ایسے تکلفات قبول نہیں کروں گا جو مجھے ذہنی طور پر مشتعل کریں گے یا ایسی کوفت پیدا کرنے کا باعث بن جائیں گے کہ میں اپنا اطمینان کھو بیٹھوں۔ اب تم یہی بات لے لو کہ جیسے تمہاری ہی پارٹی کے ایک شخص نے میرے ساتھ سینکس اور سماجی زندگی پر بحث کرنے کے دوران تمہاری آزادی کو سامنے رکھ کر مجھ سے پوچھا کہ کیا میرے ذہن میں کبھی کچھ شکوک پیدا نہیں ہوئے؟ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے۔ میں اس سوال پر ہنس پڑا تھا۔ یہ تو موضوع بحث کی وجہ سے ہوا کہ ایسا سوال پوچھا گیا۔ ورنہ میرے ذہن میں اس وقت کیا آج تک ایسا شبہ کبھی پیدا نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اس وقت بھی جب کہ تم نے جنگ بہادر سنگھ کے ساتھ دورہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور جنگ بہادر سنگھ وہی شخص تھا جو کالج کے زمانہ میں میرا بدترین دشمن اور حاسد تھا۔ اگرچہ تم نے آج تک اپنے منھ سے اس بات کا اظہار نہیں کیا کہ میں تمہارے سوا باقی تمام عورتوں سے ملنے جلنے میں کتنا محتاط واقع ہوا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں تم اس بات کا احساس ضرور کرتی ہو اور پھر تم پبلک لائف میں مجھ سے کہیں آگے بڑھ چکی ہو۔ اس قسم کی احتیاط اور ایسے تکلف پر اگر بہت زیادہ زور دیا جائے تو تم اسے میری کمزوری کا نام دو گی۔ کیوں کہ کسی چیز پر زیادہ توجہ دی جائے تو وہ شبہات پیدا کرنے کا باعث ضرور بن جاتی ہے۔

اچھا سنو —— جب میں روہنی کے ساتھ کار میں بیٹھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم کی نس نس میں دوڑتا ہوا، اُبلتا ہوا خون ایک نغمہ گانے میں مصروف ہے۔ ایک دل نشین نغمہ جس کا نشہ مجھے خاموش رہنے پر نہیں باتیں کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ میں نے روہنی کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے کھویا

ہوا دیکھ کر مسکرا رہی تھی ۔ وہ تو چاہتی تھی کہ ہم باتیں کریں ۔یوں خاموش نہ رہیں جیسے اچانک بیماری کے حملے کی وجہ سے اسپتال بھاگے جا رہے ہوں ۔ اس نے بتایا کہ کھانے کا انتظام گھر پر نہیں کیا گیا ہے کیوں کہ اس کے ڈیڈی اور ممّی بمبئی چلے گئے ہیں ۔ اور اس کا بھائی جو عیش باغ روڈ کی ایک آئس فیکٹری کا مالک ہے اس کے دوستوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا ۔ یہ سُن کر میں نے ایک ہلکا سا صدمہ محسوس کیا کہ جو دعوت میں نے اتنی حیل وحجت کے بعد قبول کی تھی در حقیقت ایک خوشگوار ماحول پیدا کرنے کے لیے نہیں تھی ۔ لیکن اب جب کہ میں اُسے قبول کر چکا تھا ، رد نہیں کر سکتا تھا ۔ میرے دل میں ایک بے اطمینانی جنم لے چکی تھی ۔ اور میں بہت تیزی سے یہ سوچنے میں مصروف تھا کہ اسے کیسے دور کیا جائے ۔

کار کے اندر روہنی نے تھوڑی سی گفتگو ہمارے بارے میں بھی کی لیکن میں نے اس موضوع کو بدلنے کے لیے اور باتیں چھیڑ دیں جس پر ایک لمحہ کے لیے اس نے میری طرف حیرت سے دیکھا ، پھر ہنس کر دوسری باتوں میں حصہ لینے لگی ۔

روہنی نے جب "ڈیالز" کے ریسٹوران میں جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے کوئی دوسری تجویز پیش نہ کی کیوں کہ میں جلد از جلد اس کی دعوت سے فارغ ہو جانا چاہتا تھا ۔ اس کی دعوت سے مجھے اب قدم قدم پر ایک گہری سوچ میں ڈوبنا پڑ رہا تھا جس کی صحیح وجہ تو میں نہیں جانتا ۔ لیکن احساس کر رہا تھا کہ اس دعوت کے لیے ماحول کسی طرح بھی سازگار نہیں تھا ۔

"ڈیالز" میں ایک بہت بڑا ہال ہے جس میں پچاس میزیں لگی ہوئی ہیں ۔ اس کا آرکسٹرا بہت مشہور ہے ۔ انگریزی اور ہندوستانی ناچ بہت خوبی سے پیش کیے جاتے ہیں ۔ ہال میں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ روہنی کو جاننے والے وہاں بہت سے

لوگ موجود تھے جنھوں نے نگاہوں سے، ہاتھوں اور مسکراہٹوں سے آداب کیا اور وہ سب کو اپنی مسکراہٹ سے جواب دیتی میرے ساتھ ساتھ چلتی، ایک کونے میں خالی میز پر آ بیٹھی۔ اس وقت تک میں صرف اپنے ہی بارے میں بہت زیادہ حساس تھا۔ اور یہی سمجھ رہا تھا کہ میں ہی دوسروں کی توجہ کا مرکز بن سکتا تھا۔ لیکن اب مجھے پہلی بار روہنی کی طرف غور سے دیکھنا پڑا۔ اس نے گہری نیلی شفن کی ساڑی باندھ رکھی تھی جس کے پلو پر سرخ گلاب کے بڑے بڑے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ اس نے آج بالوں کے مصنوعی گھونگر کھول دیے تھے۔ اس کے ترشے ہوئے بال اس کی کمر پر، شانوں پر، گالوں پر، جدھر وہ جھکتی پھسل جاتے۔ اس کے سرخ سپید چہرے پر اس کی گہری سیاہ آنکھیں اور لپ اسٹک سے رنگے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ کر میرے اندر ایک گناہ کا احساس پیدا ہوا۔ اس ایک گھنٹے کی زندگی میں جو میں نے وہاں گزاری میری اور تمھاری برسوں کی سوشل زندگی میں کتنا بڑا فرق ہے۔ یہ فرق میں نے اسی وقت محسوس کیا۔ لیکن روہنی کے قہقہے اور اس کی باتیں میرے احساس پر طاری ہو گئیں۔

کھانا بہت لذیذ تھا جو شراب مہیا کی گئی تھی اسے کئی بار پہلے بھی چکھ چکا تھا۔ لیکن کل روہنی کے ساتھ پیتے وقت بالکل یہی احساس ہو رہا تھا کہ میں نے اپنے ارد گرد برسوں سے جو احتیاط اور تکلف کی دیواریں تعمیر کر رکھی تھیں وہ بیٹھ گئی ہیں اور مجھے ہر طرف سے سب نے دیکھ لیا ہے۔ میں یونی ورسٹی کا خشک، بد مزاج اور قدامت پسند پروفیسر نہیں تھا بلکہ ایک رنگین، خوش طبع، اور ماڈرن انسان تھا۔ مجھے مجبوراً ان لمحوں کا ساتھ دینا پڑا جو روہنی اور ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے تھے۔ ان کی حیرت کو دور کرنے کے لیے مجھے ایک بے تکلفی اختیار کرنی پڑی۔ اور جب ہم وہاں سے اٹھے تو ایسا معلوم ہوا جیسے "دیالز" کے

مرصع اور نغمہ بار ہال سے لے کر باہر سڑک پر کھڑی ہوئی سفید پیکارڈ تک چالیس پچاس گز کا فاصلہ نہیں بلکہ کئی میلوں تک پھیلا ہوا ایک طویل ترین فاصلہ ہے جہاں تک پہنچتے پہنچتے مجھے کئی بار مصنوعی طور پر مسکرانا پڑے گا۔ اور سوکھی مٹی جیسی بے تکلفی کی تہیں جو میں نے اپنے آپ پر جمالی تھیں۔ ان کے ٹوٹ کر گر پڑنے کا احساس مجھے چوکے دیتا چلا جائے گا۔

جوں ہی ہم ریسٹوران سے باہر نکلے میں تھوڑی دور سامنے آدمیوں کے جھرمٹ کو دیکھ کر سکتے میں آ گیا۔ اس وقت روہنی میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھی اور میری کیفیت سے بالکل بے خبر ہو کر مسکرائے جا رہی تھی اور بار بار اصرار کر رہی تھی۔

"اتنی جلدی گھر جا کر کیا کریں گے۔ چلیے گومتی کے کنارے گھوم آئیں۔"

اس جھرمٹ میں میرا سن بلوغ کو پہنچتا ہوا لڑکا مکند کھڑا حیرت سے میری طرف تک رہا تھا۔ جیسے اسے بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی میں ہوں یا کوئی اور ——!

میں جلدی سے روہنی سے ہاتھ چھڑا کر اس کے پاس جا پہنچا۔ اس کے ساتھ اس کے دو ٹیچر اور دو اسکول کے ساتھی بھی تھے۔ میں حیران تھا آج رات تو انہیں رائے بریلی ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اس کے ٹیچروں کے ساتھ ہاتھ ملایا اور ایسی سنجیدگی اختیار کرنے کی کوشش کی جیسی ان کے چہروں پر تھی لیکن میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میں دراصل مکند کی نظروں سے خوف زدہ ہو گیا تھا جو مجھے مسلسل گھورنے کے بعد سامنے ہوتے ہوئے لوگوں کو عبور کرتی ہوئی روہنی پر مرکوز ہو گئی تھیں۔

مکند کے ایک ٹیچر نے بتلایا کہ رات بریلی میں سخت بارش ہو جانے کی وجہ سے وہ واپس آ گئے تھے۔ کیچڑ اور پانی اتنا بڑھ گیا تھا کہ لڑکوں نے واپس

آنیکا فیصلہ کر لیا تھا

مکند نے بتایا کہ اس نے لکھنؤ پہنچتے ہی مجھے ٹیلیفون پر واپس آجانے کی اطلاع دی تھی۔ لیکن میں گھر پر موجود نہیں تھا۔ اس کی آواز میں اداسی تھی۔ اس کے معصوم دل کے تڑپنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔

میں نے اسے بتایا، وہ روہنی ہے۔ میرے ایک پروفیسر دوست کی بیوی۔ وہ تمھیں نہیں پہچانتی۔ تم بہت چھوٹے تھے جب اس نے تمھیں دیکھا تھا۔ آج میں نے اسے تمہارا فوٹو دکھایا تو اُسے تمہارے اتنا بڑا ہو جانے کا یقین نہ آیا۔

اس کے دونوں ٹیچروں نے مسکرا کر مجھے میرے حواس لوٹانے میں میری مدد کی۔ لیکن مکند بالکل نہ مسکرایا۔ میں نے اس سے کہا ——

"چلو گھر چلیں!"

ہم نے اپنے ٹیچروں اور ساتھیوں کی طرف دیکھا جنھوں نے اُسے جانے کی اجازت دے دی۔ اور ہم دونوں روہنی کے پاس لوٹ گئے۔ میں جانتا تھا مجھے پہلی مرتبہ ایک غیر عورت کے ساتھ اس حالت میں دیکھ کر مکند کو ایک دھکا پہنچا تھا لیکن اس وقت سڑک پر کھڑے تو کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔ روہنی نے اسے دیکھ کر دونوں ہاتھ بڑھا دیئے۔

"ارے مکند! بھئی بالکل باپ کی شکل پائی ہے۔ وہی ماتھا، وہی ناک، وہی قد۔"

وہ میری طرف گھوم گئی اور بولی ——

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ مکند کی تصویر تمھاری جوانی کی تصویر معلوم ہوتی ہے۔"

میں نے مکند کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ مکند کسی دوسری طرف دیکھ رہا تھا روہنی یوں تو مسکرا رہی تھی لیکن مکند سے اس کی غیر متوقع اور ناپسندیدہ ملاقات کے تاثرات چھپے ہوئے نہیں تھے۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا ـــــ

"کیوں نہ مکند کو ڈرائیور کے ساتھ بھیج دیں۔ تب تک ہم یہیں ٹہلیں گے۔"

"نہیں!" میں نے فوراً اعتراض کیا ـــــ "میں بھی اب گھر جانا چاہتا ہوں۔"

مکند نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔ پھر منہ پھیر کر بولا ـــــ

"پتاجی ٹھیک تو ہے۔ میں چلا جاتا ہوں آپ بعد میں آجایئے گا۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر روہنی سے صرف اتنا کہا ـــــ

"چلیے۔ واپس چلیں"

روہنی نے بغیر مجھ سے آنکھیں ملائے قدم بڑھا دیئے۔ راستے میں ہم تینوں میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی۔ میں آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ پیچھے مکند اور روہنی۔

ہمیں گھر پر اُتار کر روہنی نے نمستے کہی اور چلی گئی۔ میں مکند کی بدصورتی ہوئی نگاہوں سے اتنا بوکھلایا ہوا تھا کہ روہنی کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول گیا۔ اندر پہنچ کر مکند بغیر میرے ساتھ کوئی بات کیے اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں کچھ دیر بیچ کمرے کے وسط میں کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اچانک میں بھی اس کے پیچھے اوپر چلا گیا۔ وہ رات کا لباس پہن کر روشنی گل کرنے کے لیے سوئچ کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہیں کھڑا ہوگیا اور گھورنے لگا۔

میں نے کہا ـــــ

"آج بہت بُرا ہوا کہ بارش ہو گئی۔"

"جی ہاں!"

اس نے ہلکی ڈوبی ہوئی آواز میں کہا اور بستر میں گھس کر بیٹھ گیا۔

تم جانتی ہو کہ ہمارا مکند کتنا باتونی ہے۔ کبھی ایک منٹ کے لیے بھی خاموش نہیں رہتا۔ جہاں سے آتا ہے۔ جو نئی چیز دیکھ لیتا ہے اس کے بارے میں کتنی دیر تک باتیں کرتا رہتا ہے۔ لیکن اس وقت وہ میرے دل کو اپنی شکوہ آمیز نگاہوں سے اتنا چھید رہا تھا اور اتنا معصوم اور چھوٹا سا معلوم ہو رہا تھا کہ جی چاہتا تھا اسے گود میں اٹھا لوں لیکن میں اس سے ڈر رہا تھا۔ وہ مجھ سے کتنی دور جا رہا تھا۔ اس نے میرے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ ٹانگوں پر کمبل ڈالے بیٹھا رہا۔ اور میں اس کے پڑھنے کی میز کے کونے پر بیٹھا اسے دیکھتا رہا کہ اب کیا کروں۔ وہی کمرہ تھا وہی ساز و سامان تھا جو ہمیشہ میری نگاہوں کے سامنے رہتا ہے۔ لیکن اب مکند وہ نہیں تھا۔ صرف وہی بدلا ہوا تھا۔

میں نے سوچا میں اس کے سامنے اپنی صفائی پیش کر دوں لیکن اس طرح تو میرے گناہ کا ایک طرح سے سرزد ہونا ثابت ہو جائے گا کیوں کہ صفائی جو پیش کر دوں گا۔

پھر میں نے محسوس کیا مجھے روہنی کے ساتھ دیکھ کر مکند نے ایک خطرے کا احساس کیا تھا۔ اُسے اپنی چھوٹی سی دنیا جس میں وہ بڑے مزے سے پرورش اور تعلیم پا رہا تھا ڈولتی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ اس لیے اُسے یہ یقین دلانا ضروری تھا کہ اس کی دنیا اور مستقبل دونوں محفوظ ہیں۔ یہ خیال آتے ہی اُس کے پاس پلنگ پر جا بیٹھا اور کہا۔۔۔۔۔۔

"بیٹا تم۔۔۔ اس عورت کو میرے ساتھ دیکھ کر کچھ ناراض ہو نا؟"

"میرا کیا مطلب ہے اُس سے"۔۔۔ اُس نے غصّے سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ "مجھے نیند آرہی ہے پتا جی۔ ذرا لائٹ آف کر دیتے تو اچھا تھا۔"

"کر دوں گا پہلے میری بات تو سن لو!"

"صبح دیکھا جائے گا۔ اس وقت مجھے سخت نیند آرہی ہے۔"

"لیکن۔۔۔۔"

لیکن کچھ نہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ ماتا جی سے کچھ نہیں کہوں۔ جائیے میں کچھ نہیں کہوں گا۔"

یہ سُن کر میں کانپ گیا۔ تم یقین مانو مکند تکیے میں منہ چھپائے سسک رہا تھا۔ اور میں اس کے پاس بیٹھا کانپ رہا تھا کہ اس نے یہ خیال کیوں اپنے دل میں بٹھا لیا ہے کہ میں اس کی دنیا تباہ کر رہا ہوں۔ میں ایسا کیوں کروں گا۔ میں نے اسے بتانا شروع کیا۔ اس کے سامنے جھوٹ بولا کہ۔۔۔ روہنی کو تمہاری ماں نے مجھے ملنے کے لیے خط لکھا تھا۔ اس نے پالٹکس کا ایک پرچہ بہت خراب کیا تھا۔ وہ چاہتی تھی میری سفارش سے اس کے کچھ نمبر بڑھ جائیں تاکہ فیل ہونے سے بچ جائے۔ جس پروفیسر کے پاس اس کے پرچے گئے تھے وہ مجھ سے واقف تھا تمہاری ماں سے اس نے میرے لیے ایک خط منگوا لیا تھا۔ اور اسی کام کے لیے میں اس کے ساتھ گیا تھا۔ واپسی پر وہ خواہ مخواہ تکلف سے کام لے کر مجھے زبردستی کھانا کھلانے لے گئی تھی۔

مکند نے میری بات مان لی۔ اُس نے میرا یقین کر لیا اور مسکرانے لگا۔ جب میں نے اس کی معصوم آنکھوں میں اس کی کھوئی خوشی کو لوٹتے ہوئے دیکھا تو جذبات سے مغلوب ہو گیا۔ ساتھ رہا تھا شرمسار بھی کہ میں نے جھوٹ بولا ہے۔ میں جلدی سے وہاں سے اٹھ گیا۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر مکند

مکند نے شوخی سے کہا۔

"پتاجی اب میں آپ کو بتاؤں رائے بریلی میں ہم پر کیا بیتی؟"

"بتاؤ!"

"جب ہم بس سے اُتر کر سرکاری بنگلے میں داخل ہو رہے تھے تو ہمارا ایک ٹیچر پھسل کر پانی میں گر پڑا۔ اور کچھ لڑکوں نے بے اختیار ہو کر تالی بجا دی۔" یہ کہتے کہتے مکند زور سے ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی میں مَیں نے بھی ساتھ دیا۔ اور پھر لائٹ آف کر کے نیچے اُتر آیا۔

پیاری سوبیتا، یہ واقعہ ہے جس نے مجھے تمھیں اتنا طویل خط لکھنے کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم سمجھ گئی ہو گی کہ اب تمھیں کیا کرنا ہو گا۔ مکند اس کی دنیا اور اس کا مستقبل بہت قیمتی ہیں۔ ہمیں ان کی ہر طرح حفاظت کرنا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری غلطی سے اس پر ذرا بھی آنچ آئے۔ میں تم سے صرف یہی چاہتا ہوں کہ تم بھی کسی طرح اس کے دل میں اس یقین کو پختہ کر دو کہ وہ عورت ایک بُری عورت نہیں تھی۔ اُسے سچ مچ تم نے بھیجا تھا۔ اُسے سچ مچ مجھ سے کام تھا اور میں اس کا ضروری کام کرنے کے لیے ہی اس کے ساتھ گیا تھا۔ میں چاہتا ہوں جب تم یہاں آؤ تو تمھاری باتوں سے میری غلط بیانی کا امکان باقی نہ رہے۔ اور ہو سکے تو روہنی سے مل کر تم ایک آدھ مرتبہ اسے اپنے گھر لے آؤ تاکہ مکند کے دل سے شک اور خوف بالکل مٹ جائے۔ مکند ہمارا بیٹا ہے اس کا مستقبل ہم دونوں کو عزیز ہے۔ اس کی ہمیں حفاظت کرنی چاہیے۔ یہ بات میں پھر سے کہہ دوں کہ روہنی سے میں اپنے آپ نہیں ملا تھا۔ میرے اندر ایسی کوئی خواہش یا تحریک موجود نہیں تھی۔ مجھے اس سے مل کر جو تھوڑی بہت خوشی نصیب ہوئی تھی اسے اس وقت کھو چکا ہوں۔ اُمید کرتا ہوں کہ تم میرے دل کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کرو گی۔ تمھارا ہمیشہ:۔۔۔۔۔۔"

سفرِ مسلسل

میں جب بھی گاڑی سے سفر کرتا ہوں اور جب ڈبے میں داخل ہوتا ہوں وہ بوڑھا مجھے ضرور دکھائی دے جاتا ہے۔ ایک کونے میں بیٹھا ہوا، میری طرف گھور گھور کر دیکھتا ہوا۔

اسے دیکھ کر مجھے ڈر نہیں لگتا۔ بس ایک تھکن سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ دراصل وہ خود اس قدر تھکا ہوا ہوتا ہے کہ اسے دیکھنے والا گھبرا اٹھتا ہے حیران ہو کر سوچنے لگتا ہے۔ کسی انسان کا جسم اس قدر بھی بوڑھا اور نڈھال ہو سکتا ہے کہ اس کے لیے اپنے جسم کو دو قدم بھی اور آگے لے جانا سخت مشکل معلوم ہونے لگے۔ چاہے اسے ابھی بہت دور جانا ہو!

وہ مجھے پٹنہ اسٹیشن پر ملا تھا۔ میں اس گاڑی پر پٹنہ ہی سے سوار ہوا تھا۔ لیکن مجھے حسب خواہش جگہ نہیں ملی تھی اسے میں نے ڈبے کے اندر داخل ہوتے ہی دیکھ لیا تھا۔ ایک کونے میں تقریب قریب تین آدمیوں کی جگہ گھیرے

ہوئے اور میری طرف ایسی تیز اور بے رحم نظروں سے دیکھتا ہوا جیسے میں اپنے بیٹھنے کے لیے جگہ ضرور طلب کروں گا۔ اس کی نگاہوں میں شکایت بھی تھی۔ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟ میں کسی اور ڈبے میں کیوں نہیں چلا جاتا؟ لیکن میں اس پر سے نظریں ہٹا کر دروازے کے پاس کھڑا دیکھتا رہا تھا۔ باہر روشنی تھی۔ دھند اور تیز ہوا تھی۔ میں نے گرم جیکٹ کی زپ چڑھائی تھی۔ لیکن کچھ دیر بعد میں نے کچھ سوچا تھا اور جیسے بوڑھا جانتا تھا۔

پھر دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ دوسرے درجے کے چھوٹے سے ڈبے میں مجھے بیٹھنے کے لیے اسی کے پاس جگہ مل سکتی تھی۔ اگر وہ ذرا سمٹ کر بیٹھ جاتا یعنی پاؤں اٹھا کر۔ لیکن اس نے مجھے اپنے اوپر کھڑا دیکھ کر اپنی آنکھوں میں اور زیادہ بیزاری بھر لی۔ اور میں نے پہلی بار اُسے قریب سے دیکھا۔ میں نے آج تک کسی چہرے پر اتنی زیادہ جھریاں نہیں دیکھی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کوئی بہت پرانی پیلے پتھر کی چٹکی ہوئی کوئی اینٹ ہو۔ چھوٹی چھوٹی ایک دوسرے سے گتھی ہوئی بے شمار پیچ در پیچ ان گنت لکیریں تھیں۔ گالوں کا گوشت لٹک رہا تھا۔ ناک پھول کر لمبی اور چوڑی ہو گئی تھی۔ ہونٹوں کا گوشت بھی لٹک رہا تھا۔ اس کے سر پر اون کی تہہ کی ہوئی بندر کیپ تھی۔ جسم پر کتھئی رنگ کا ایک پرانا اوورکوٹ اور پتلون اور اس کی گردن ایک مفلر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ آدھے جسم پر ایک کمبل پڑا ہوا تھا۔

"سنیے! آپ یہاں بیٹھ جائیے۔"

مجھے نہیں معلوم تھا اس کے سامنے دوسرے کونے میں بیٹھی ہوئی نیلی شیفون کی ساڑھی والی لڑکی اسی کے ساتھ ہے۔ جب سے میں نے اسے دیکھا تھا وہ ایک کتاب پڑھنے میں محو تھی۔ ان کے درمیان کوئی بات ہی نہیں

ہوئی تھی۔ لیکن میں نے اس کی پیش کش قبول نہ کی۔ ان کے درمیان ایک ٹرنک پر رکھے ہوئے ہولڈال پر بیٹھنے کی اجازت چاہی۔ لڑکی نے بخوشی اجازت دے دی۔ میں شکریہ کہہ کر بیٹھ گیا تو وہ احسان مندنگاہوں سے ایک بار پھر میری طرف دیکھ کر اپنی جگہ پہ بیٹھ گئی اور کتاب پڑھنے لگی۔

بوڑھے کی طرف میں نے کچھ دیر بعد دیکھا۔ اس وقت دیکھا جب محسوس کرلیا کہ وہ مجھ پر سے اپنی نظریں نہیں ہٹائے گا۔ اس کی نظریں مجھے ہر لمحہ چبھیدتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں۔

میں نے سر گھمایا تو اسے مسکراتے ہوئے پایا۔ اس کے چہرے پر سے وہ تمام تر برہمی غائب ہو چکی تھی جو میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کی تمتماہٹ بھی ایک عجیب سی چمک میں بدل گئی تھی دھواں لگے پیلے بلب کی طرح جو کرنٹ ملنے پر کچھ نہ کچھ تو روشنی دیتا ہی ہے۔

"مجھے دیکھتے ہو ؟ کتنا بوڑھا ہو گیا ہوں ؟ کس قدر تھک گیا ہوں ؟ مہذب طریقے سے بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ لوگ مجھے بد دماغ اور سڑی سمجھتے ہیں ؟ تم بھی یہی سوچ رہے ہو ؟ ہے نا ! لیکن میں عمر اور صحت کی وجہ سے کس قدر مجبور ہوں۔ لوگ یہ نہیں دیکھتے۔ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ انھیں فرصت کہاں ہے سامان سے لدے پھندے ہر اس جگہ پر گرنے کے لیے تیار رہتے ہیں جو انھیں قبول کر سکتی ہے۔ !"

اس کی آنکھوں میں پھر ایک خشونت کی جھلک نظر آئی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگا کر اسے بھی پیش کی تھی۔ اس نے انکار نہیں کیا۔ لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں چاہتا تھا کہ میں سگریٹ اس کے ہونٹوں میں لگا دوں اور پھر سلگا بھی دوں۔ وہ اپنے ہاتھ کمبل کے اندر سے نکالنا نہیں چاہتا تھا۔

اب اس نے ہولے ہولے کش لگانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی لڑکی کچھ لمحوں تک ہم دونوں کی طرف غور سے دیکھنے کے بعد پھر اپنی کتاب میں محو ہوگئی تو بوڑھے نے چند لمحوں کے لیے اپنے دونوں ہاتھ کمبل سے باہر نکال لیے۔ دراصل وہ مجھے اپنا رعشہ دکھانا چاہتا تھا اس کے ہاتھ بڑی طرح کانپ رہے تھے۔ اس کی اس حرکت کو ڈبے کے ہر شخص نے دیکھا وہ سب اس عجیب و غریب شخصیت سے متاثر ہو رہے تھے۔ آپس میں کھُسر پھُسر بھی کر رہے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو پھر سے ڈھانپ دیا۔ کمبل پر سگریٹ کی راکھ گرتی تو اسے بھی ہٹا دیتا تھا، وہ سر گھما کر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مجھے دیکھتا تھا مسکرانے کی کوشش کرتا تھا لیکن میں جانتا تھا وہ ہر وقت مسکرانے والا شخص نہیں ہے۔ اس کے ہونٹ مرجھائے ہوئے تھے۔ اسے مسکرائے ہوئے ایک طویل مدت گزر چکی تھی، وہ محض میری وجہ سے ایسا کر رہا تھا۔ بڑی کوشش سے۔

اس کی سگریٹ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ اسے کھانسی آگئی۔ سگریٹ اس کے نچلے ہونٹ کے ساتھ چپکی چپکی سی کانپنے لگی۔ اس کی لڑکی بجلی کی سی سرعت سے اٹھی سیٹ کے نیچے سے مٹی کا ایک برتن نکالا جس پر جھک کر بوڑھے نے بلغم گرائی اور پھر چوبی دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر ہانپنے لگا۔ جب تک وہ متوازن ہو سکا میں نے بڑی خاموشی سے دو سگریٹ اور پی لیے۔ چند بار اس لڑکی کی طرف بھی گھور کر دیکھ لیا جو اپنے باپ کی وجہ سے بہت پریشان نظر آتی تھی۔ وہ کچھ کہنا تو نہیں چاہتی تھی لیکن ہر بار جب میری طرف نظریں اٹھاتی اور جھکاتی تو یوں لگتا جیسے کچھ کہتے کہتے رک گئی ہے۔

”جی چاہتا ہے اب یہیں رک جاؤں۔ اسی جگہ جان دے دوں۔“ بوڑھے نے اچانک بولنا شروع کر دیا تھا وہ میری طرف سیدھا نہیں دیکھ رہا تھا۔

کیوں کہ اس نے اپنا سر دیوار کے ساتھ ٹکا رکھا تھا جس کے ساتھ میں بھی کمر اور سر لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ لیکن وہ مجھ ہی سے مخاطب تھا اس لیے میں نے اپنا سر اس کی طرف گھما لیا۔

"اب زندگی میں رکھا ہی کیا ہے مسٹر! زندہ رہنے کی ساری کشش تو ختم ہو گئی۔ زندگی کی ساری خوب صورتی جو ایک چمک دار آگ کی مانند ہوتی ہے بجھ چکی ہے اس کا سارا رس نچڑ گیا ہے۔ ایک ایک بوند تک ٹپک چکی، اب تو! جھوٹ نہیں کہتا۔ اب میں سچ مچ مر جانا چاہتا ہوں۔ زندہ رہنے کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔ مقصد ہو بھی اور اسے پورا نہ کر سکوں تو جی کر کیا کروں گا؟ اُف میں کس قدر دکھی ہوں! کس قدر بے بس ہوں!"

بوڑھا آنکھیں بند کر کے پھر ہانپنے لگا۔ لڑکی اس کی طرف مسلسل دیکھتی رہی۔ ہم سب مسافر بھی اُسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لڑکی نے دو ایک بار اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کی ٹانگوں پر کمبل پھیلایا۔ وہ لمبے دُبلے جسم کی گندمی رنگ کی انیس بیس برس کی لڑکی تھی۔ بہت خوب صورت نہیں تھی لیکن کسی حد تک دل کش بھی تھی۔ اپنے باپ کی ہم شکل نیلی شیفون کی ساڑھی کے نیچے اس نے پورے بازو کی گہرے رنگ کی سوئٹر پہن رکھی تھی جو گلے تک بند تھی۔ بالوں کو بغیر تقسیم کیے کانوں پر سے لے جا کر گردن کے پیچھے ایک خوب صورت جوڑے میں سمیٹ رکھا تھا۔ بہت دیر تک اسے دیکھنے کے بعد مجھے یکایک احساس ہوا اس کی سب سے بڑی کشش تو آنکھوں کی افسردگی اور گہرائی ہے جیسے سامنے حدِ نظر تک پھیلا ہوا خاموش سمندر ہو اور دھیرے دھیرے بڑھتی ہوئی رات ہو... اور کوئی تنہا پرندہ سطح سمندر کے اوپر بہت اونچائی پر اُڑتا پھرتا ہو۔ پتا نہیں گاڑی کہاں رُک گئی تھی۔ کتنی دیر تک رُکی رہی تھی۔ جب پھر

پھر تو میں نے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ وہ کافی دیر خاموش رہا تھا۔ دوسرے مسافر بھی اس کی طرف متوجہ تھے۔ اچانک گاڑی کے شور سے کہیں اونچی اور بھاری آواز میں وہ پھر بولنے لگا۔ دراصل اس کی آواز تھی بھی ایسی ہی۔ اس کے صرف خاموش ہو جانے کے بعد گاڑی کی آواز اونچی معلوم ہوتی تھی۔

"میرا سب سے لائق بیٹا ارجن تھا۔ ذہانت، محنت اور خوش اخلاق ان تینوں خاصیتوں سے مل کر وہ بنا تھا۔ اس سے جو بھی ملتا اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ میرا سب سے بڑا لڑکا وہی تھا۔ اس نے قانون کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بہت بڑا وکیل ثابت ہو۔ ہندوستان کا نامی گرامی وکیل۔ ہندوستان آزاد ہوا تو اس کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ وہ اپنے ہم پیشہ طبقے میں سب سے کم عمر اور مشہور ترین وکیل تھا۔ پاکستان سے یہاں آکر اس نے میرے مشورے پر عمل نہیں کیا۔ وہ کسی صوبائی راجدھانی میں بسنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ سنٹرل گورنمنٹ کی کوئی بڑی جاب حاصل کرنے میں لگا رہا۔ لیکن ناکام رہا۔ پھر اچانک غائب ہو گیا۔ ایک مدت تک غائب رہا۔ ہم لوگ تو رو دھو کر اور صبر شکر کر کے بیٹھ ہی گئے تھے۔ اچانک خبر آگئی کہ وہ پاکستان میں رہ رہا ہے۔ سنا تم نے؟ وہ پاکستان میں رہ رہا تھا پھر وہیں جا بسا تھا جہاں سے اکھڑ کر ہم لوگ یہاں آئے تھے۔ لیکن اب وہ نور احمد تھا۔ اپنی عمر سے بھی بڑی ایک گریجویٹ سیدانی کا شوہر۔ یہ تھی اس باپ کے خوابوں کی تعبیر جس نے اپنے بیٹے سے بے پناہ محبت کی۔ اس کا کیریئر بنانے کے لیے ایک ایک پائی جوڑ جوڑ کر رکھی۔ اپنے اخراجات کم کیے، اپنی خواہشات کا گلا گھونٹا، لیکن اس کی تعلیم جاری رکھی۔ وہ ارجن لال کے بجائے نور احمد ہو گیا اور میرے کسی خط کا جواب دینا بھی مناسب نہ سمجھا۔ میں نے اسے چلے آنے کی کئی ترغیبیں دیں، لالچ دیا، منت

سماجت بھی کی، لیکن وہ راضی نہ ہوا۔ ایک بار خود وہاں گیا۔ اپنی محبت اور شفقت کا واسطہ دیا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا، مجھ سے اس طرح ملا جیسے میرا بیٹا ہی نہ ہو۔ میں نے اسے کبھی پڑھایا یا پالا پوسا ہی نہ ہو۔ ارجن بیں، ابھی تک اس کے بھولے بچپن کا لمس موجود ہے۔ اس کی یاد آتی ہے تو ہتھیلیوں کے نیچے کا خون اب بھی سرسرانے لگتا ہے۔ لیکن وہ ـــــ وہ تو سب کچھ بھول گیا تھا۔"

وہ خاموش ہوا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بہہ رہے تھے، لڑکی نے اس کی آنکھیں پونچھ دیں۔ دھیرے سے اس کا بازو دبا کر کہا۔۔۔ "چپ ہو جاؤ بابا! اب کیا رکھا ہے گزری باتوں کو یاد کرنے میں!"

بیٹی کے اصرار کا اس پر صرف اتنا اثر ہوا کہ وہ دیر تک روتا رہا۔ دو ایک بار تو اونچی آواز سے رو دیا۔ لڑکی نے اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا اور نرمی سے کہا "بس اب چپ ہو جاؤ بابا! تمہیں میری قسم! نہیں تو میں!" پھر وہ معذرت خواہ سی ہو کر آنسو پونچھتی ہوئی اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔ بوڑھا سر گرا کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کچھ دیر رونے سے اس کا جی ہلکا ہو گیا تھا۔ کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہنے لگا۔۔۔

"تمہیں اپنے دوسرے بیٹے نہال کا قصہ سناؤں۔ ارجن سے تین برس چھوٹا تھا۔ بی اے وہیں کر لیا تھا، راولپنڈی میں آ کر ایم اے کیا۔ اس کی دلچسپی اکنامکس میں تھی۔ کہتا تھا ڈاکٹریٹ لندن سے کروں گا۔ میں نے اس کی خاطر مکان گروی رکھ دیا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اچانک اس کا دماغ چل گیا۔ شاید بہت زیادہ پڑھتے رہنے سے ایسا ہوا ہو! میں نے اسے اس لیے تو نہیں پڑھایا تھا کہ وہ میرے پاس بیٹھ کر مجھ سے پوچھا کرے ـــــ

"تم کون ہو؟ تمھارا نام کیا ہے؟ تم اس گھر میں کیوں رہتے ہو؟" بس یہی تین سوال ہر وقت یہی تین سوال مجھ سے پوچھا کرتا۔ اور میں سُن سُن کر رو دیا کرتا تھا۔ اُسے بتاتا تھا "میرے بچے یہ میں ہی تو ہوں۔ تیرا باپ، مجھے پہچانتے کیوں نہیں؟ یہ گھر تیرا ہی ہے! تیرے ہی واسطے سرکار کے دروازے پر دستک دے دے کر اپنی جائداد کے کلیم میں حاصل کیا ہے۔ جب تو پروفیسر ہو جائے گا تو ادھار کا سارا روپیہ واپس کر کے اسے پھر سے حاصل کر لیں گے۔ لیکن وہ میری کوئی بات نہ سُنتا ہی تھا اور نہ سمجھتا تھا، بس اپنی ہی رٹ لگائے جاتا۔ تم کون؟ تم یہاں کیوں رہتے ہو؟ کبھی کبھی تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکتا۔ میں بہت دکھی ہو کر اپنا منہ پیٹ لیتا۔ کتنے اسپتال دیکھ ڈالے۔ کہاں کہاں سے علاج نہ کرایا لیکن وہ ٹھیک نہ ہو سکا۔ آخر ایک دن وہ پاگل خانے کی دیواروں سے اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر یہ پوچھتا ہوا مر گیا ــــ تم کون ہو؟ تم یہاں کیوں رہتے ہو؟ تمھارا نام کیا ہے؟"

گاڑی اچانک پرتاپ گڑھ اسٹیشن پر رک گئی۔ ہم سب چونک پڑے۔ بوڑھے کی داستان اس قدر موثر تھی کہ وقت کا احساس بالکل ختم ہو گیا تھا۔ ہمارے ڈبے میں کچھ اور مسافر آ گئے۔ خاموش سمندر میں جیسے ہل چل مچ گئی۔ وہ لوگ بوڑھے کے ساتھ گھس کر بیٹھنے کے لیے مُصر تھے۔ ان کی مداخلت نے بوڑھے کے چہرے پر بے بسی پھر پیدا کر دی۔ لیکن ہم سب نے انھیں سمجھا بجھا کر یہاں وہاں بٹھا دیا۔ وہاں ہم لوگوں نے چائے بھی پی۔ چائے کا آرڈر میں نے دیا۔ بوڑھا تو خاموش تھا لیکن اس کی لڑکی مجھے منع کرنے لگی۔ چائے پینے کے دوران میں میں نے دیکھا کہ بوڑھے کی آنکھوں میں ایک حریصانہ چمک پیدا ہو گئی ہے۔ جس ٹوسٹ پر میں نے مکھن لگا کر اسے پیش کیا اسے وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دو نوالے

بنا کر ہڑپ کر گیا۔ اسے میں نے دوسرا ٹوسٹ دیا تو اسے بھی اسی سرعت کے ساتھ کھا گیا لیکن میں نے اپنے چہرے پر کسی قسم کا ایسا تاثر پیدا نہ ہونے دیا، جس سے اس کی لڑکی کی بے بسی اور افسردگی میں اضافہ ہوتا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنے باپ کی اس حرکت پر پہلے سے زیادہ ملول ہو چکی ہے۔ میں نے سارے ٹوسٹ بوڑھے کو کھلا دیے۔ ٹوسٹ کھا کر وہ بے حد خوش ہوا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی مسرت دیکھ لی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے میرا کندھا بھی دبایا۔ گاڑی پھر چل پڑی۔ چائے پینے کے دوران میری اور اس لڑکی کی نگاہوں کا کئی بار آمنا سامنا ہوا۔ اس کی نظروں میں وہی معذرت تھی۔ میرے اتنے قریب ہونے اور اس کی طرف اتنی دلچسپی سے تکنے کے باوجود اس کی افسردگی کم نہیں ہوئی تھی۔

کچھ دیر جب ہم سب اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے تو بوڑھے نے پھر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس کی بیٹی نے بڑی سختی سے اسے منع کر دیا۔ لڑکی کی آواز میں بے حد ناراضگی تھی۔ اس کا باپ سب کے لیے تماشا کیوں بنا ہوا ہے؟ لیکن اس نے بیٹی کے احتجاج کو نظر انداز کر دیا، اور مجھ سے کہنے لگا:۔

"میرا تیسرا بیٹا اشوک تھا۔ اپنے سب بھائیوں سے مختلف دبلا پتلا اور سانولا۔ صرف اسی کی شکل اپنی ماں سے ملتی تھی۔ باقی سب کے سب تو مجھ پر تھے۔ اتفاق سے مجھے سب سے زیادہ لگاؤ اسی بچے سے ہوا۔ پتا نہیں کیوں؟ شاید اس لیے کہ وہ کبھی کوئی شرارت نہیں کرتا تھا۔ کسی کے ساتھ جھگڑتا نہیں تھا۔ جسمانی طور پر کمزور ہونے کی وجہ سے اور گھر باہر دونوں جگہ سب سے دب کر رہتا تھا۔ اسے اکثر میں اپنے ساتھ شکار پر لے جاتا تھا۔ اسے بندوق چلانا سکھاتا، چالاک اور ہوشیار بننے کی تلقین کرتا لیکن اس پر کوئی اثر نہ پڑا۔

پڑھنے لکھنے کے معاملے میں بھی بہت ڈل نکلا۔ ہائی اسکول سے نکلنے کے لیے اسے
تین سال زیادہ لگے۔ میں نے سوچا اسے میں اپنے ساتھ کاروبار میں رکھوں گا۔
پوسٹل سروس سے ریٹائر ہو جانے کے بعد میں نے کاروبار شروع کر لیا تھا۔
لیکن صاحب اس لڑکے نے تو اچانک ہی پر پرزے نکالنے شروع کر دیے۔ دیکھتے
دیکھتے کالا مریل لڑکا اپنے لباس اور بننے سنورنے میں غیر معمولی توجہ برتنے لگا۔
یہ دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ شکر کیا کہ اسے اپنی زندگی دلچسپ معلوم
ہوئی۔ اس نے کچھ دوست بھی بنائے جن کے ساتھ وہ گھومتا جاتا تھا لیکن
ایک دن وہ اچانک گھر سے بھاگ گیا۔ میرے بہت سے روپے بھی لے گیا۔
ہم سب کو بالکل تماشا بنا کر چھوڑ گیا۔ میں نے اس کی تلاش کرائی۔ اخباروں
میں چھپوایا۔ اس کے فوٹو نکلوائے۔ اس سے لوٹ آنے کی التجا کی۔ اس کی
ماں کی سخت بیماری کا واسطہ دیا۔ لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔
پھر مجھے معلوم ہوا کہ وہ بمبئی میں فلمسٹار بننے کے چکر میں ہے۔ وہ فلمسٹار بن جاتا
تب بھی ایک بات تھی۔ لیکن اسے تو وہاں کاندھے پر سینما کے بورڈ اٹھا کر
سڑکوں پر گھومنا پڑا۔ پھر ایک بار شراب اسمگل کرنے کے جرم میں جیل بھی گیا۔
میرے سمجھانے بجھانے پر بھی گھر نہیں لوٹا تو میں بھی تھک ہار کر خاموش بیٹھ رہا۔
پتہ نہیں اب وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔"

اب اس کی آواز میں سے وہ لرزش غائب تھی جس کے بعد اس کی آنکھوں میں
آنسو آجاتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اشوک کا قصہ سنا کر وہ میرا ردعمل جاننے کے لیے
میری طرف دیکھنے لگا تھا۔ میں نے اسے ایک سگریٹ پیش کی تھی اس کے ہونٹوں
میں لگا کر سلگایا بھی تھا۔ وہ بہت خوش ہو کر ہولے ہولے کش کھینچ رہا تھا۔
"اب میں تمہیں دو اور بیٹوں کے بارے میں بتاؤں گا۔ اندر تو شادی

کرنے کے فوراً ہی بعد مجھ سے الگ ہو گیا۔ اسے ایسی بیوی ملی جسے ہمارے گھر کا ماحول پسند نہ آیا۔ وہ ہم سے نفرت کرتی تھی۔ بھگوان جانتا ہے ہم ایسے بڑے تو نہیں ہیں۔ بدنصیب ضرور ہیں، لیکن ایسے ہرگز نہیں کہ ہم کو دیکھنا بھی گوارا نہ کیا جا سکے! دراصل اسے اپنے میکے سے ایسا کرنے کے لیے شہ ملتی تھی۔ جب وہ میرے برسر روزگار بیٹے کو مجھ سے الگ کر کے لے گئی تو میری شکایت اس کے پریوار کے کسی بشر نے نہیں سنی۔ وہ سب مجھے ہی ذمہ دار سمجھتے تھے، مجھے اپنے پریوار میں بھی کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو میرے دکھ کو سمجھتا۔ میرا ساتھ دیتا، اندر کو جا کر سمجھاتا۔ اس کی بیوی اور بیوی کے ماں باپ کو برا بھلا کہتا۔ میرا پریوار تھا ہی کہاں؟ چھوٹے سے گردی رکھے ہوئے مکان کے اندر جو دو چار جیو کسی طرح زندہ تھے۔ انہیں پریوار کیوں کر کہا جا سکتا ہے؟ پریوار تو با نہیں ہوتی ہیں۔ جیسے برگد یا کسی اور بڑے درخت کی پھیلی ہوئی شاخیں۔ یہاں تو ایک ایک کر کے سب ٹہنیاں جدا ہوئی جا رہی تھیں، کٹ رہی تھیں۔ پتے جھڑتے جا رہے تھے۔ ملک کی تقسیم کیا تھی کوئی تیز طوفان تھا۔ جیسے کتنے ہی بھرے پرے اور ایک دوسرے سے گندھے ہوئے خاندان سوکھے تنکوں کی طرح بکھیر کر رکھ دیئے۔ جس شہر کے لوگ کسی نہ کسی رشتے سے ایک دوسرے سے بندھے ہوئے رہتے تھے انہی لوگوں میں ایک دوسرے کے دکھ سکھ کا احساس تک ختم ہو گیا۔ احساس ختم ہوا تو احترام بھی ختم ہو گیا۔ ایک دوسرے کا مذاق اڑایا جانا ہی زندگی کا ایک مقصد ٹھہرا۔ میرے بچے مجھ سے بچھڑ جاتے تھے تو لوگ بجائے ہمدردی کرنے کے ہنستے تھے۔ خوش ہوتے تھے۔ اس صدمے کو میری بیوی نے بھی محسوس کیا وہ پے در پے صدموں کی وجہ سے سخت بیمار رہنے لگی تھی۔ ایک دن چل بسی۔ بڑی خوش نصیب تھی وہ مر تو سکی، میں تو مر بھی نہ سکا۔ اب تک کس قدر سخت جان ہوں! پاگل ہی ہو جاتا

تو دکھ درد کا احساس ہی ختم ہو جاتا!“

کچھ دیر تک وہ کھانستا رہا۔ بلغم بھی نکالی۔ پھر ذرا دیر دم لے کر بولا ”منوہر سے میں نے محبت کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اسے میں نے شروع ہی سے غیر سمجھا۔ جیسے اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس سے محبت کرکے میں خود کو دھوکا نہیں دوں گا۔ جو اولاد بڑی ہو کر مجھے چھوڑ کر چل دیتی ہے اس کے لیے میں دکھ کیوں اٹھاؤں؟ اسی لیے میں اس کے ساتھ سوتیلے باپ کا سا سلوک کرتا رہا تھا۔ اپنے بُرے سلوک کے لیے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے اسے تعلیم و تربیت سے بھی محروم رکھا۔ میری نظروں کے سامنے وہ آوارہ اور اوباش بنتا رہا۔ مجھے کبھی افسوس نہیں ہوا۔ جیسا اسے بنانا چاہتا تھا وہ کبھی بن نہ سکتا تھا۔ پھر مجھے پشیمانی کیوں؟ وہ بھی کہیں چلا گیا ہے۔ سُنا ہے کبھی دہلی پولیس کے ساتھ مل کر جوا کھلانے کا دھندا کرتا تھا۔ پھر ایک بار شراب خانے میں بلیرڈ بھی لگایا تھا۔ پھر پتہ نہیں اس کا کیا ہوا۔ کبھی کبھی اپنے مصائب یاد کرکے انتہائی مایوسی ضرور ہوتی ہے۔ اسی وقت مر جانے کی خواہش بھی شدید ہو جاتی ہے لیکن پھر میں اپنے آپ کو سنبھال بھی لیتا ہوں۔ سوچ لیتا ہوں، ابھی میرے مرنے کا وقت نہیں آیا۔ ابھی کچھ عرصہ اور جینا ہے ــــ ابھی کچھ کام باقی ہے۔“

بوڑھا کھڑکی میں سے سر نکال کر باہر دیکھنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا کے تیز جھونکوں کے سامنے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے اوورکوٹ کا لمبا کالر بار بار اُٹھ کر اس کے کان کے ساتھ ٹکرانے لگا۔ گاڑی رائے بریلی اسٹیشن کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ جب رک گئی تو اس کی کھڑکی کے سامنے ایک پھل والا سر پر ٹوکری اٹھائے کھڑا ہو کر چلانے لگا۔ اس کے پاس امرود تھے۔ بوڑھے نے امرودوں کی طرف للچائی ہوئی نظر سے دیکھا

پھر لڑکی سے کہا۔" رانی دیکھ تو یے اچھے ہیں نا!"

اس کی لڑکی نے انکار کے طور پر سر ہلا دیا۔" نہیں بابا، اچھے نہیں ہیں۔"

" دیکھ تو لے"! اس نے ضد کی۔ میں نے کھڑکی میں سے سر ڈال کر امرود ٹٹولے واقعی اچھے نہیں تھے۔ لیکن چوں کہ بوڑھے کی خواہش تھی دو امرود لے لیے۔ بوڑھے نے دو امرود دیکھ کر منہ بنا لیا۔ بولا۔" اور لو نا۔ ان سے کیا بنے گا؟" پھر وہ بیٹی سے بولا۔" میرے کوٹ کی جیب میں سے پیسے نکال لے رانی۔"

میں نے ایک سیر امرود لے لیے۔ سوچا ہم سب مل کر کھائیں گے۔ لیکن جب بوڑھے کو جلدی جلدی کچر کچر کھاتے دیکھا تو خود کھانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کی لڑکی پہلے ہی باپ سے خفا تھی۔ وہ بھی مجھے امرود کھلانے کی پیش کش نہ کر سکی۔ وہ اکیلا ہی کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ سارے امرود کھا گیا۔ کھانے کے بعد مسکرانے لگا۔ میری طرف داد طلب نظروں سے دیکھا! اس کے ہونٹوں پر امرودوں کی نمی لگی تھی۔ جسے اس نے کوٹ کی آستین کے ساتھ پونچھ ڈالا۔ اس کی بیٹی نے اس کے دونوں ہاتھ پھر کمبل کے نیچے کر دیے۔ بوڑھے نے بڑی محبت سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ اس کی طرف دیکھ کر بہت جلد اداس بھی ہو گیا۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔" یہ میری بیٹی ہے۔"

" بابا!" یکایک لڑکی غصے سے کانپنے لگی اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ پھر جلدی سے بھاگ کر ٹائلٹ میں چلی گئی۔

" تین سال ہوئے میں نے اس کی شادی کی تھی۔ یہ میری آخری اولاد ہے جتنے صدمات میں اٹھا چکا ہوں ان کا اثر اس لڑکی پر بھی پڑا ہے۔ میں اسے تعلیم بھی نہ دلا سکا۔ کیوں کہ جلد سے جلد شادی کرنے کی فکر کرتا رہا۔ کیوں کہ

اس کے بعد میں نے جان دینے کے لیے سوچ لیا تھا۔ بہت جلد بازی سے کام لے کر اس کا رشتہ کیا۔ جلدی میں کیے ہوئے کام اکثر غلط ہو جاتے ہیں۔ یہ کام بھی غلط ہی ہوا۔ سسرال میں اسے سکھ نہیں ملا۔ وہاں ہر شخص کا حکم چلتا ہے، لیکن اس بیچاری کی کوئی التجا تک نہیں سنی جاتی۔ تین بار لوٹا کر گھر بھیج دیا۔ میں نے ہر بار گھر کا کوئی نہ کوئی سامان بیچ کر اسے سسرال میں پہنچا دیا۔ اب وہ لوگ امرتسر چھوڑ کر بہار میں جا کر رہنے لگے ہیں۔ میں آخری بار اپنا سب کچھ بیچ کر وہاں گیا تھا۔ لیکن وہ لوگ اسے رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اس پر بے ادب اور بے سلیقہ ہونے کا الزام دھرا۔ تعلیم کی کمی کی شکایت کی۔ جس وقت شادی ہوئی تھی اس وقت اس کی کسی کمی کو معلوم نہیں کیا گیا تھا۔ اس وقت وہ لوگ خود بھی تو بہت کم تر تھے۔ اب ان کی برتری کا کیا کہنا! اب تو وہ ٹھیکیدار ہیں، ٹھیکیدار۔"

اچانک ٹائلٹ کا دروازہ کھلا۔ وہ باہر نکل آئی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اندر جا کر وہ جی بھر کر روئی تھی۔ ہم سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ سمجھ گئی اس کا باپ اس کا قصہ بھی سنا چکا ہے۔ وہ جیسے سب کے سامنے عریاں کھڑی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر جہاں کھڑی ہے وہیں بیٹھ جائے۔ وہ رو اٹھنے کے لیے تیار دکھائی دی کہ اچانک بوڑھے کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ وہ کھڑکی میں سے آدھا جسم نکال کر قے کر رہا تھا۔ اتنی شدت سے کہ اس کا سارا جسم بید مجنوں کی طرح لرز رہا تھا۔

رانی بھاگ کر باپ کے ساتھ چمٹ گئی۔ "بابا! بابا!!"

بوڑھے کی قے بند نہ ہو سکی۔ قے کے ساتھ اس کو دست بھی آنے لگے۔ جہاں وہ بیٹھا تھا وہاں غلاظت بکھر گئی اور لکھنؤ پہنچتے پہنچتے اس نے دم توڑ دیا۔ اسے کوئی مدد بھی نہ دی جا سکی۔ اس کی موت اس قدر آناً فاناً

ہوئی کہ سب مسافر دم بخود رہ گئے ۔۔۔ اس بات کا کسی کو سان و گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس قدر جلد مرجائے گا۔ اپنی زندگی کے کٹھن سفر کی طوالت کا ذکر کرکے وہ سب کو افسردہ بناتا رہا تھا وہی سفر کتنی جلدی ختم ہوگیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے بالکل آخری چند گھنٹوں میں ہم سے ملا تھا، لیکن ہم سب کو اپنی گزشتہ زندگی کے سفر میں ساتھ لے گیا تھا۔ اور ایسا لگ رہا تھا کہ ہم اس کے ساتھ ایک طویل مدت سے بھٹک رہے ہوں۔ اس کا سفر ختم ہوچکا ہے لیکن ہمیں ابھی آگے جانا ہے۔

جب گاڑی اس کی لاش اور بیٹی کو چھوڑ کر آگے بڑھنے لگی تو میں بے حد افسردہ ہوگیا۔ دوسرے دن مجھے جگادھری پہنچنا تھا۔ میں نے جمال پور میں بلینڈنگ کی اعلیٰ تربیت حاصل کی تھی۔ تربیت کے بعد میرا وہاں اپوائنٹ منٹ ہوا تھا۔ کل وہاں مجھے چارج لینا تھا۔ پٹنہ اسٹیشن پر مجھے گھر کے سب لوگ وداع کرنے کے لیے آئے تھے۔ میرے شہر کے سارے احباب بھی۔ وہ سب میری ترقی سے بے حد خوش تھے۔ جب گاڑی میں سوار ہوا تھا تو میں بے حد خوش تھا۔ کسی قدر جوش میں بھی۔ لیکن جس وقت سے میری نگاہ اس بوڑھے پر پڑی تھی۔ میں اداس ہوگیا تھا۔ اب وہ پلیٹ فارم پر ایک اسٹریچر پہ چادر میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔ رانی اس کے پاس بیٹھی دونوں ہاتھوں میں منھ چھپائے سسک رہی تھی۔

مجھ سے نہ رہا گیا۔ گاڑی چھوٹنے سے ایک آدھ منٹ پہلے اپنا سامان لے کر اتر گیا۔ رانی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اسے حوصلہ دینے لگا۔ اس نے میری آواز سنی تو سر اٹھا کر مجھے حیرانی سے دیکھا۔ اسے میرے وہاں موجود ہونے کی قطعی اُمید نہیں تھی۔ میں نے اسے بتایا۔ میں نے گاڑی چھوڑ دی ہے وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر سر جھکائے بیٹھی رہی۔ میں نے اس کے چہرے پہ حوصلے کی ایک

جھلک بھی دیکھی۔

پولیس نے بوڑھے کی لاش پوسٹ مارٹم کرانے سے پہلے جانے کی اجازت نہ دی۔ میں نے اپنے خرچ پر لاش کی گاڑی منگوائی۔ گاڑی میں رانی کے اور میرے علاوہ پولیس کے دو کانسٹبل بیٹھے۔ اجنبی شہر میں اس قسم کے عجیب سے حالات میں گھومنے کا یہ میرا پہلا موقعہ تھا۔ مجھ سے ذرا فاصلے پر رانی کھڑکی کے ساتھ سر ٹکائے خاموش بیٹھی دور خلا میں گھور رہی تھی۔ اس کی ناک کی نوک پر آنسو رکا ہوا تھا۔

پوسٹ مارٹم کرانے میں چند گھنٹے لگ گئے۔ اس دوران میں میں شہر میں جاکر بانس پھونس اور کفن وغیرہ کا سامان لے آیا۔ رانی بھی میرے ساتھ تھی۔ ہم دونوں بالکل خاموشی سے یا معمولی اشاروں سے ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتے تھے۔ زیادہ تر باتیں تو میں ہی اسے سمجھاتا تھا۔ میں چاہتا تھا ایسے حوصلہ شکن حالات میں وہ میرا ساتھ ایک مرد کی طرح دے۔

جس وقت میں نے بوڑھے کو کفن میں لپیٹا تو وہ اس کے پاس گھٹنوں میں سر دیئے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی، اسپتال کے دو کان داروں کی مدد سے میں نے لاش کو گاڑی کے اوپر رکھوایا۔ پھر رانی کے ساتھ گاڑی کے اندر جا بیٹھا۔

شام پڑ چکی تھی۔ گومتی کے کنارے بھینسا کنڈ شمشان میں ایک لاش اور بھی جل رہی تھی۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ ڈرائیور کی مدد سے دو آدمی ڈھونڈ کر ارتھی کو گھاٹ پر لے گئے۔ رانی کو میں نے ذرا دور چبوترے پر بٹھا دیا۔ قریب ہی مرگھٹ کا لکڑی کا ٹال تھا۔ ٹال والے نے لکڑی تول کر ایک طرف لڑھکا دی اور دام لے لیے۔ لکڑی اٹھا کر مرگھٹ کے کنارے لے جانے کے لیے کوئی آدمی

نہیں تھا۔ مرگھٹ کا رکھوالا ایک سادھو تھا جو لاش کے پاس بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے دور سے دوسری جلتی ہوئی لاش کی روشنی میں رانی کو چبوترے پر بیٹھا ہوا دیکھا۔ اور ہمت کر کے دو بڑی لکڑیاں دونو کاندھوں پر رکھ کر چل پڑا۔ آٹھ من لکڑیاں ڈھوتے ڈھوتے میرے کاندھے شل ہونے لگے۔ میری قیمتی جیکٹ مسک گئی۔ اچانک رانی نے مجھے لکڑیاں ڈھوتے ہوئے دیکھ لیا تو بھاگ کر میرے پاس آئی۔ بت سی بنی چند لمحوں تک میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر آگے بڑھ کر ایک لکڑی اس نے بھی اٹھائی۔

میں نے لکڑی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ "یہ تم سے نہیں اٹھے گی۔ جاؤ وہیں جا کر بیٹھ جاؤ۔"

یہ سن کر اس کی سسکی نکل گئی۔ روتے روتے بولی "میری خاطر آپ کو کتنی تکلیف اٹھانی پڑی ہے۔"

میں اسے سہارا دے کر چبوترے پر لے گیا۔ بولا کچھ نہیں۔ میرا دل دکھ سے بھرا ہوا تھا۔ ذرا فاصلے پر ٹرک کے کنارے رکی ہوئی گاڑی کا ڈرائیور بڑے اطمینان سے سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے اپنی جیکٹ اتار کر رانی کو دے دی۔ اور لکڑیاں ڈھونے کے لیے پھر لوٹ گیا۔

آخر چتا تیار ہو گئی۔ میں نے بوڑھے کو اپنے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر چتا پر لٹا دیا۔ سادھو نے کچھ منتر پڑھے۔ لاش کو جلانے کے لیے میں جو سانگری لایا تھا۔ اسے چتا پر بکھیر دیا۔ بوڑھے کے چہرے پر پڑا ہٹا کر اس کے منہ میں گھی انڈیلا اور پھر پھونس کو آگ لگا کر چتا کے اندر رکھ دی۔ سوکھی لکڑی نے ذرا سی دیر میں آگ پکڑ لی۔ دیکھتے دیکھتے شعلے اونچے اٹھنے لگے۔ میں بدن پر بنیان اور پتلون پہنے چتا کے چاروں طرف گھوم گھوم کر ایک ایک لکڑی کے

ذریعے آگ کو ہر طرف پھیلاتا جا رہا تھا تاکہ ہمارے چلے جانے کے بعد آگ بجھ نہ جائے۔ اگرچہ سادھو نے وعدہ کیا تھا کہ وہ آگ کو بجھنے نہ دے گا۔ لیکن ان لوگوں کا کیا بھروسہ۔ رات کو جنگل کے جانور اکثر چتا پر سے بھی لاش گھسیٹ لیتے ہیں۔ میں جو کچھ کر رہا تھا ایک لگن کے ساتھ کر رہا تھا۔ میرے اندر ایک لمحے کے لیے بھی ڈگمگاہٹ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ صرف غم کا احساس شدید ہو گیا تھا۔ انتہائی تھکن بھی محسوس ہونے لگی تھی ــــ آگ کے شعلوں کے درمیان بوڑھے کا جسم پڑ پڑ کی آواز دیتا ہوا جل رہا تھا۔ اچانک شعلوں کے اس پار مجھے کسی کا چہرہ دکھائی دیا۔ آگ کی روشنی میں سرخ اور عجیب سا چہرہ۔ میں ایک لمحے کے لیے لرز کر رہ گیا۔ پھر میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ رانی تھی۔ میری جیکٹ کو لپیٹ کر اپنے سینے کے ساتھ لگائے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں چتا کے گرد گھوم کر اس کے پاس گیا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر سر جھکا لیا، ہم دونوں کتنی دیر تک جلتی ہوئی چتا کو دیکھتے رہے۔ چتا کے اندر آگ ہی آگ نظر آتی تھی یا ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرے ہوئے انگارے۔ ذرا ذرا دیر کے بعد خاموشی سے بہتی ہوئی گومتی میں مچھلی یا کچھوا چھپ کی ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ باہر نکلتا اور پھر ڈبکی لگا جاتا تھا۔

میں نے رانی سے کہا "چلو اب نہا ئیں۔ اس کے بعد لوٹ جائیں گے۔"

گھپ اندھیرے میں ہم دونوں نے چبوترے پر بنے ہوئے غسل خانے میں غسل کیا۔ ہم نے جو کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ بھی دھو ڈالے۔ پھر انہی گیلے کپڑوں کو پہن کر باہر آ گئے۔ رات کے اندھیرے میں چتا چمک رہی تھی۔ اس کی روشنی کی وجہ سے اندھیرا اور بھی گہرا معلوم ہوتا تھا۔

ڈرائیور نے ہمیں اسٹیشن پر اتارا۔ میں نے اسے اسّی روپے دیئے۔ رانی نے جھجک کے ساتھ کہا "بابا کے سوٹ کیس میں روپے ہیں۔" میں نے اسے

کوئی جواب نہ دیا۔ ہم دونوں اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر گئے۔ دس بج رہے تھے۔ کلوک روم سے سامان اٹھوا کر ویٹنگ روم میں گئے۔ وہاں جاکر کپڑے بدلے۔ بیرا ہم دونوں کے لیے ٹی اسٹال سے گرم گرم چائے اور بسکٹ لے آیا۔ ہم دونوں نے دوپہر سے کچھ نہیں کھایا تھا بھوک تو ہم بھول ہی گئے تھے۔ میں نے رانی کی طرف چائے بڑھائی تو اس نے سر جھکالیا۔

اس کے بھیگے ہوئے بال کمر پر بکھرے پڑے تھے۔ سر جھکاتے ہی بال اس کے منہ پر آگرے۔ اس نے ہاتھ سے بالوں کو پیچھے کر دیا۔ چائے کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا۔ میں نے کہا۔

"چائے نہیں پیو گی؟"

وہ خاموش رہی۔ جلدی جلدی آنکھیں جھپکانے لگی۔

میں نے چائے اس کے ہاتھ میں دے دی۔ "لو پیو۔"

"بابا اس وقت"! اس کی سسکی نکل گئی۔ اسے اس وقت بابا یاد آگئے جو چائے پیتے وقت اس کے ساتھ نہیں تھے۔ میں نے چند لمحے خاموش رہ کر اسے پھر سے چائے پینے کے لیے کہا۔ اس نے بڑی کوشش سے چائے کا آدھا پیالہ ختم کیا۔ پھر میں نے بھی اسے مجبور نہ کیا۔

ویٹنگ روم کے ایک کونے میں بستر بچھا کر ہم دونوں بیٹھ گئے۔ بہت دیر سے ہمارے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس قدر غم زدہ اور تنہا تھی کہ اپنے آپ کوئی بات چھیڑ ہی نہیں سکتی تھی۔ خود مجھے بھی اس سے کہنے کے لیے کوئی بات نہیں سوجھتی تھی۔

"تمہارے بابا کے بارے میں کس کس کو اطلاع دینا ہے؟"

اس نے بہت ہی ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ "کس کو اطلاع دیجیے گا؟

کوئی ہے ہی نہیں!"

"اپنے کسی بھائی کا پتہ معلوم ہو تو لکھوا دو۔ کم سے کم اطلاع تو دے ہی دینی چاہیے۔"

"مجھے نہیں معلوم۔ وہ لوگ کبھی آئے ہی نہیں۔"

"اپنے پتی کا پتا!" یہ بات میں نے بہت جھجک کے ساتھ پوچھی اس نے آنکھیں اٹھا کر مجھے پہلی بار چند لمحوں تک مسلسل گھورا۔ میں اس کی ایسی نظروں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ یہی توقع بھی کر رہا تھا۔ اس نے صاف مضبوط اور تیز آواز میں جواب دیا۔

"جی نہیں۔ انھیں اطلاع دینے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن پھر بھی ضروری تو ہے۔ بتاؤ وہ کہاں رہتے ہیں؟"

بڑی مشکل سے اس نے پتا بتایا۔

دوسرے دن صبح ہوئی تو کل کی بات بہت پرانی سی لگی۔ وہ نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر کتاب پڑھ رہی تھی۔ ٹھیک میرے سامنے ایک کرسی پر بالوں میں کنگھی کر کے چوٹی بنالی تھی۔ مجھے نہیں جگایا تھا۔ مجھے دیر تک سوئے رہنے دیا تھا جانتی تھی میں کل بہت زیادہ تھک گیا تھا۔ مجھے جاگتے ہوئے پایا تو اٹھ کر میرے پاس آئی۔ پوچھا "آپ چائے کس وقت پیتے ہیں۔؟"

اس کی افسردگی کم نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس کی آواز میں اب کسی قسم کی جھجک یا لرزش نہیں تھی۔

"منگواؤ۔" یوں لگا وہ روز ہی صبح اٹھ کر مجھے چائے پوچھتی ہے۔ میں مسکرا بھی دیا۔ لیکن وہ اٹھ کر چلی گئی۔ بیرے سے چائے لانے کے لیے کہہ کر پھر کرسی پر جا بیٹھی۔ پھر کتاب پڑھنے لگی۔

میں کتنی دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ویٹنگ روم میں اور بھی بہت لوگ تھے۔ میرے علاوہ بھی کچھ لوگ اسے گھور رہے تھے۔ بالکل اس طرح جیسے دوسر کی عورت کو گھورا جاتا ہے۔ میں نے اپنے اندر کسی قدر حسد کا جذبہ محسوس کیا۔ دھیرے سے اسے پکارا۔ "رانی۔"

اس نے سر گھما کر میری طرف دیکھا۔

"یہاں آؤ۔"

میں نے اس کے ہاتھ سے کتاب لے لی اور کہا۔ "بیٹھو۔ یہ تم کل سے کونسی کتاب پڑھ رہی ہو؟"

"یونہی وقت کاٹنے کے لیے یہ کتاب اُٹھا لائی تھی۔" وہ میرے پاس بیٹھ کر بولی۔

میں کچھ دیر تک کتاب کے صفحے اُلٹتا پلٹتا رہا۔ کتاب کا نام دیکھا۔ لکھنے والے کا نام بھی دیکھا۔ پھر چند صفحے یوں ہی اُلٹ دیئے۔

"ناول ہے؟"

"جی ہاں۔"

"اچھی ہے؟"

"مجھے کیا معلوم؟" وہ شرما گئی۔

"کیوں؟ پڑھ رہی ہو مگر یہ نہیں بتا سکتیں اچھی ہے یا بُری۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

اتنے میں چائے آگئی۔ اس نے چائے بنا کر مجھے دی۔ اپنا پیالہ بھی بنایا ہم دونوں چائے پینے لگے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

میں نے اپنے سوال پر غور کیا تو معلوم ہوا اس کا کوئی جواب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ٹائم ٹیبل اٹھا کر اس کے صفحے الٹنے لگا۔ پھر اسے بتایا۔

"گاڑی تین بجے جاتی ہے۔"

وہ اسی طرح سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کی ایسی نظروں سے گھبرا کر میں نے شیو کی آڑ لی۔ شیشے کے سامنے جا کر منہ پر دھیا دھپ صابن تھوپنے لگا۔ یاد آیا اس وقت تک میں جگادھری پہنچ گیا ہوتا۔ یہاں نہ رک گیا ہوتا تو اس وقت اپنے عہدے کا چارج لینے کے لیے ورکشاپ کے گیٹ پر پہنچ چکا ہوتا۔ اب کل وہاں پہنچوں گا۔ راستے میں رک جانے کا انھیں میرا تار مل چکا ہوگا۔ گھر والوں کو میری اس غیر حاضری کا حال معلوم ہوگا تو وہ بہت ناراض ہوں گے خصوصاً میرے پتا جی کو تو میری کوتاہیاں بالکل پسند نہیں آتیں۔ لیکن انھیں کیا معلوم کہ آدمی کبھی کبھی اس قدر بے بس ہو سکتا ہے کہ اس سے ایک قدم بھی آگے بڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں اگر چلا گیا ہوتا تو اس لڑکی کا نہ جانے کیا حشر ہوا ہوتا! وہ تن تنہا کیسے کیسے اور کہاں کہاں نہ بھٹکی ہوتی۔

میں نے سر گھما کر دیکھا وہ میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر سر جھکا لیا۔ گھبراہٹ کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کا چہرہ پہلی بار اس طرح سرخ ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر میں بے حد مسرور ہوا۔ دھیرے دھیرے اس کی افسردگی دور ہو جائے گی۔

نہا دھو کر میں نے کپڑے بدلے، سامان پیک کر لیا گیا تو ہم دو ایک دوسرے کے سامنے حیران سے کھڑے رہ گئے۔ اب کیا کریں؟ کہاں جائیں؟

گاڑی چھوٹنے میں ابھی پانچ گھنٹے باقی تھے۔ سامان کو پھر سے کلوک روم میں رکھوا کر ہم دونوں اسٹیشن سے باہر نکل گئے۔ شہر کی طرف جانے والی ایک چوڑی پکی سڑک پر کچھ دور تک بلامقصد چلتے گئے۔ زندگی میں کبھی کبھی ایسے لمحے اچانک آ جاتے ہیں کہ تب کچھ کہنے یا کرنے کو کچھ نہیں ہوتا۔ ایسا لگ رہا تھا ہم بولتے بولتے اچانک گونگے ہو گئے ہیں!

میں نے ایک رکشا رکوا کر اسے شمشان گھاٹ تک چلنے کے لیے کہا۔ مجھے اس وقت بھی دنیا میں بوڑھے کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا جیسے ہم چتا میں جلتا ہوا چھوڑ آئے تھے۔ وہ راکھ کا ڈھیر بن چکا ہوگا۔ وہ سچ مچ راکھ ہو چکا تھا۔ دھرتی کے سینے پر بچھی ہوئی راکھ ایک چادر کی طرح جس کے نیچے وہ سویا ہوا سا لگا۔

جہاں میں پیروں کے بل بیٹھا ہوا تھا وہیں میرے قریب رانی بھی آ کر بیٹھ گئی۔ بالکل میرے سامنے سمٹ کر اپنا سر میرے کندھے کے ساتھ لگا دیا۔ میں نے اس کے کندھے پر بازو پھیلا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا اور پھر ہر گھاٹ کے سادھو سے ساری راکھ اٹھا کر گومتی میں بہا دینے کے لیے کہا۔ جب راکھ گومتی کی نذر ہو چکی تو مجھے پہلی بار بوڑھے سے جدا ہو جانے کا احساس ہوا جیسے اب وہ کبھی نہیں ملے گا۔ کبھی دکھائی نہیں دے گا۔

ہم دونوں رکشا میں واپس آ گئے۔ راستے میں نہ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ اسے بتانے لگا۔ "کل تم نے پٹنہ اسٹیشن پر دیکھا تھا مجھے چھوڑنے کے لیے کون کون آیا تھا؟ ان عورتوں کو؟ جو ٹھیک تمھاری سیٹ کے سامنے پلیٹ فارم پر کھڑی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک میری بھابی تھی۔ ایک موسی اور ایک چھوٹی بہن۔ اس کا نام کانتا ہے۔ بی اے

میں پڑھتی ہے۔ بہت شرارتی ہے۔ کل کہہ رہی تھی۔ "بھیّا اب تمھاری شادی کر دیں گے ایک لڑکی میں نے پسند کر رکھی ہے۔" اس پر میں نے اس کے کان اینٹھ دیئے تھے اور بھابی نے چمک کر کہا تھا: "ٹھیک ہی تو کہتی ہے بچاری۔ اب تم کب تک یوں لڑ چھنگ بنے گھومتے رہو گے۔" ان کی باتیں سن کر بھیّا اور پتاجی بھی ہنس پڑے تھے۔

رانی نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں اس کی خاموشی نظرانداز کرکے پھر بولا۔ "میرے دو بھائی ہیں ایک پٹنہ میں پروفیسر ہیں اور دوسرے ٹاٹا میں انجینیئر ہیں۔ دونوں کی شادی ہو چکی ہے۔ ہماری بہن ایک ہی ہے۔ موسیاں دو۔ ایک تو تم نے اسٹیشن پر دیکھی تھی نا۔۔۔ وہ بڑی ہیں۔ میری ماں سے بھی بڑی۔ چھوٹی موسی کلکتہ میں ہیں۔ وہ گرمیوں میں آئی ہوئی تھیں۔ میرے ماماجی بھی وہیں آ گئے تھے۔ ہم لوگ دراصل اندور کے رہنے والے ہیں۔ لیکن اب وہاں کوئی نہیں رہتا۔"

اپنے آپ باتیں کرتے ہوئے مجھے بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ لیکن میں محظوظ بھی ہو رہا تھا۔ مجھے یقین تھا وہ میری باتیں بڑی دلچسپی سے سن رہی ہے۔ اسے میرے بارے میں سب کچھ جاننا بھی چاہیے تھا۔ لیکن اس کی خاموشی مجھے خائف کیے دے رہی تھی۔

اس کے بعد میں نے اسے جگادھری میں اپنی نئی نوکری کے بارے میں بتایا نال پور میں پائی ہوئی ٹریننگ کا حال سنایا۔ میں نے وہاں پانچ سال ٹریننگ حاصل کی تھی۔ ٹریننگ کے دوران میں ایک بار میں سخت بیمار پڑ گیا تھا۔ مجھے ٹائیفائڈ ہو گیا تھا۔ پورے دو مہینے اسپتال میں رہا تھا۔ میرے پاس پتاجی اور ماتاجی آ کر رہے تھے۔ ایک بار بھابی اور چھوٹی موسی بھی دیکھنے کے لیے آئی تھیں۔

اسٹیشن پر ہم دونوں نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ کل سے بھوکے تھے نا۔ پھر ہم کتنی دیر تک پلیٹ فارموں پر ٹہلتے رہے۔ چھوٹی لائن کے بڑی لائن کے کل ملا کر بارہ پلیٹ فارم ہیں۔ لمبے لمبے پلیٹ فارم۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک گئے تو کسی بنچ پر بیٹھ گئے۔ بیٹھے بیٹھے تھک گئے تو پھر اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ سارے وقت میں صرف میں نے ہی باتیں کیں۔ وہ ایک بار بھی نہ بولی۔ ایک بار مجھے تھوڑا غصہ آ گیا، فیصلہ کر لیا، اب میں بالکل نہیں بولوں گا جب تک وہ خود بات نہیں کرے گی۔ میں نے تقریباً ایک گھنٹہ خاموشی میں گزار دیا۔ میرے لیے خاموش رہنا بہت مشکل کام تھا۔ جب کوئی لڑکی قریب ہو اور اچھی طرح سن بھی سکتی ہو تو کوئی کیسے خاموش نہیں رہ سکتا۔ لیکن میں تو بول بول کر تھک چکا تھا۔ اس نے میری خاموشی کو محسوس کر ہی لیا۔ میرے قریب کھسک کر میرے کوٹ کا کالر چھو کر کہنے لگی۔۔۔

"آپ کو یہ رنگ بہت پسند ہے؟ آپ کی جیکٹ کا بھی یہی کلر ہے اور کوٹ کا بھی!"

"ہاں" میں نے خوش ہو کر جواب دیا "میرے پسندیدہ رنگ اور بھی ہیں۔ میرے ٹرنک میں دو سوٹ اور ہیں کل جگادھری پہنچ کر دکھاؤں گا لیکن اب وہ پرانے ہو چکے ہیں۔ ایک دو تنخواہوں کے بعد ایک نیا سوٹ خریدوں گا۔ تم میرے ساتھ چل کر رنگ کا انتخاب کرنا۔ اچھا یہ بتاؤ! تمہارے پسندیدہ کون کون سے کلر ہیں۔ کیا مجھے اپنی مرضی کا انتخاب کرنے کی اجازت دو گی؟"

یہ سن کر وہ شرما گئی کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے پھر پوچھا تب بھی خاموش رہی۔

کسی لڑکی کا زندگی میں اچانک آجانا کس قدر عجیب اور سہانا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اچانک بہار آ جائے! وہ مجھے اس قدر خوب صورت پہلے نہیں معلوم ہوئی تھی اسے بھی زندگی میں اتنی توجہ پہلے نہیں ملی تھی۔ میری محبت کے احساس نے اس کی

دل کشی بڑھا دی تھی۔ جب ہم پنجاب میل کے لیے ایک نمبر پلیٹ فارم کی طرف بڑھ رہے تھے تو وہ میرے ساتھ سر اٹھا کر چل رہی تھی۔ لیکن اس کی افسردگی بالکل ختم نہیں ہوئی تھی۔

"کل جگادھری پہنچتے ہی گھر والوں کو اطلاع دوں گا کہ میں نے اپنے لیے لڑکی کا انتخاب کر لیا ہے؟" اس نے کوئی جواب نہ دیا، ایک بار میری طرف دیکھ کر پھر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ شاید پھر آنسو آگئے تھے اس کی آنکھوں میں!

گاڑی کے آجانے پر میں سامان رکھوانے کے لیے اندر چلا گیا۔ وہ باہر کھڑی رہی، اس نے ابھی تک میرے ساتھ چلنے سے نہ انکار کیا تھا نہ اقرار۔ لیکن وہ میرے ساتھ جا رہی تھی۔ مجھے یقین تھا۔ وہ اور جا بھی کہاں سکتی تھی؟ سامان رکھوا کر باہر آیا تو اس کے پاس ایک اور شخص کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ گرد آلود کپڑے۔ بکھرے بکھرے بال۔ لمبے سفر سے مرجھایا ہوا چہرہ۔ اس کے ہاتھ میں ایک اٹیچی تھا۔ اسے تو میں نے اس ڈبے میں سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا جس کے اندر میں نے سامان رکھوایا تھا۔ رانی سے جلدی جلدی کہہ رہا تھا ـــــ "تار ملتے ہی میں بھاگل پور سے کار کے ذریعہ پٹنہ پہنچا لیکن وہاں سے میل چھوٹ چکا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو سو روپے اور دیے وہ مجھے مغل سرائے پہنچا گیا۔ مغل سرائے سے میں نے میل پکڑ لیا۔ تمہارے اکیلے رہ جانے کے خیال سے تو میں پریشان ہو اٹھا تھا۔ گھر والے منع کرتے رہے۔ لیکن میں پاگلوں کی طرح بھاگا چلا آیا۔ اچھا بتاؤ بابا کو کیا ہوا تھا؟ ان کا داہ سنسکار کیسے ہوا؟"

مجھے اپنے پیچھے کھڑا پا کر یکا یک چپ ہو گیا۔ مجھے پہچاننے کی کوشش کی۔ رانی نے میری طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ میرے ساتھ آنکھیں ملائیں۔ وہی چھلاتی ہوئی آنکھیں لیکن ان میں محبت اور معذرت کی بھی گہری جھلک تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ وہ بڑی مشکل سے کہہ سکی ـــــ "یہ میرے پتی ہیں۔ انھیں

آپ نے تار دیا تھا؟"

میں نے اس کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا۔ پھر دونوں نے سر جھکا لیا۔ پھر میں پلٹ کر گاڑی کے اندر چلا گیا۔ رانی کا سامان اتار کر ان کے پاس رکھ دیا۔ رانی خاموشی سے دیکھتی رہی "اس کا پتی بھی دیکھتا رہا۔ گاڑی چلی تو اس وقت بھی رانی سر جھکائے کھڑی تھی۔ جلدی جلدی آنکھیں جھپکا کر آنسوؤں کو پی جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اپنے سفر کے بارے میں سوچنے لگا جو جگادھری جا کر ختم نہیں ہو جاتا تھا۔ اس سے بھی آگے جاتا تھا ـــــ بہت آگے۔!

تمہارے بچّے جئیں

۶ر اپریل ۱۹۶۳ء کو امرتسر کے ایک ہوٹل میں ایک پاکستانی جاسوس پکڑا گیا تھا! اس کا نام اللہ دتّہ معلوم ہوا ہے۔ پکڑے جانے کے فوراً بعد پنجاب پولس نے اس کے خلاف ثبوت مہیا کرنے کے لیے پہلے تو دو ہفتوں کا ریمانڈ لیا تھا۔ اس کے بعد اور دو ہفتوں کا اور پھر پورے دو مہینوں کا بھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اللہ دتّہ کے خلاف کوئی اطمینان بخش مسالہ حاصل نہ کر پائی۔

جب پولس نے اللہ دتّہ کو ایک ہوٹل کے اندر پکڑا تھا۔ اس وقت وہ وہاں اُبلے ہوئے انڈے اور کوئی عمدہ سی شراب کی بوتل سامنے رکھے نہایت ہی خوش گوار موڈ میں بیٹھا تھا۔ جس لمحے پولس اسے گرفتار کرنے کے لیے ہوٹل میں داخل ہو رہی تھی، وہ بڑے جوش سے بیرے کو زور سے پکار کر ایک مرغ مسلّم لانے کا آرڈر دے رہا تھا۔ لیکن اتنی تفصیلات میں جانے سے کیا ہوگا؟ اس دلچسپ واقعہ کا آغاز یہاں سے کیوں نہ کیا جائے، آج پولس اللہ دتّہ کو تین ماہ کے بعد پھر سٹی مجسٹریٹ کی

کچہری میں پیش کر رہی ہے اور خیال اغلب یہ ہے کہ وہ اللہ دتہ کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کے لیے کچھ اور مہلت لینے کی درخواست پیش کرے گی۔

اچھا ___ ایک بات اور آپ کو بتا دی جائے۔ اس ملزم کے پکڑے جانے کے بارے میں کہیں کوئی ہل چل نہیں ہے۔ نہ دلوں میں نہ ہی اخباروں میں کسی کو کوئی دلچسپی ہے ہی نہیں۔ ایسے جاسوس تو آئے دن سرحد کی دونوں طرف پکڑے جاتے رہتے ہیں اس لیے آپ بھی اس سے کوئی خاص توقعات وابستہ نہ کیجیے گا۔ لیکن یوں کہ اخبار کا نمائندہ اسے دل چسپ سمجھتا ہے اس لیے وہ اس کا بیان پوری دلچسپی سے کرے گا۔ ممکن ہے ایسی خبروں میں وہ فطری شوق کی وجہ سے کہیں کہیں جذباتیت کا مظاہرہ بھی کر بیٹھے۔

تو جناب آپ کچہری کے کمرے میں پہنچ جائیے، وہی کچہری میں دکھائی دینے والا ایک مجسٹریٹ، اس کا پیشکار، ایک پولس انسپکٹر، چار سپاہی اور ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا اللہ دتہ۔

اللہ دتہ درمیانے قد کا کالے رنگ کا آدمی ہے۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک ہے اور مونچھوں کے بال سفید ہوتے جا رہے تھے۔ بدن پر صرف ایک کرتہ اور چار خانے کی لنگی ہے۔ اس کا پھول دار چہرہ بتاتا ہے کہ اسے حراست کے دوران خوب مارا پیٹا جا رہا ہے۔

"حضور، اس کے خلاف ابھی تک کوئی ثبوت نہیں مل سکا ہے۔ اسے حراست میں رکھے رہنے کے لیے کچھ مدت اور بڑھا دیں۔"

دیکھا آپ سے کیا کہا تھا میں نے! لیکن سب انسپکٹر کے لہجے میں بڑی مایوسی ہے۔ دراصل وہ مجسٹریٹ کو یقین دلانا چاہتا ہے کہ ہم نے تو اسے بیکار ہی پکڑ لیا۔

اللہ دتہ بھی کچھ کہنا چاہتا ہے۔ وہ اس بات کا انتظار نہیں کرتا کہ مجسٹریٹ صاحب بہادر جب کاغذات پر سے سر اٹھائیں تبھی وہ اپنی بات شروع کرے۔ وہ کہہ ہی ڈالتا ہے ـــــ "تمھارے بچے جیئیں، پولس والے مجھے جاسوس بتاتے ہیں۔ پر میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہنے کے لیے تیار ہوں۔ میں جاسوس نہیں ہوں۔ مجھے یہ کسب آتا ہی نہیں ہے۔"

مجسٹریٹ نے سر جھکائے ہوئے ہی اس کی ساری بات سن لی ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ اور بہت ہی دھیمے لہجے میں کچھ پوچھتا ہے جو اللہ دتہ کو سنائی نہیں دیتا تو وہ فوراً سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہوا کہہ اٹھتا ہے "تمھارے بچے جیئیں!!" یعنی پھر سے کہیے! اور مجسٹریٹ اپنی انا پر تھوڑی سی ٹھیس محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ ایک بار پھر پوچھتا ہے ـــــ "تم آخر اس ملک میں کیا کرنے کے لیے آتے رہتے ہو؟"

"تمھارے بچے جیئیں، میرا پاسپورٹ تو سامنے ہی رکھا ہے۔ آپ کے یہاں میں اپنے ہم وطنوں سے ملنے کے لیے آتا ہوں۔ امرتسر، لدھیانہ اور کرتار پور صاحب میں جہاں جہاں آکر وہ لوگ بس گئے ہیں۔ بے شک کسی سے بھی پوچھ لو۔"

کچھ لمحوں تک خاموشی چھائی رہتی ہے۔ پولس شاید اس کے بتائے ہوئے مقامات پر جاکر پہلے ہی ہر شخص سے مل کر تحقیقات کر چکی ہے۔ اللہ دتہ خود ہی اس خاموشی کو توڑتا ہے "تمھارے بچے جیئیں، آخر اس جرم کی سزا کتنی ہے؟ میرا مطلب ہے اگر بہت زیادہ نہ ہو تو اسے یوں ہی قبول کر لوں۔ اس سے کم سے کم بیکار کی حراست اور پولس کی مار سے تو نجات مل جائے گی! تین مہینے تو اندر رہ ہی لیا ہوں۔"

سپاہیوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ لیکن وہ مجسٹریٹ اور انسپکٹر کو سنجیدہ پاکر مسکرانا بھول گئے۔

اب ایسا لگتا تھا مجسٹریٹ صاحب اس کی رہائی کا حکم جاری کر دینا چاہتے ہیں لیکن چوں کہ انسان اپنی تقدیر پر قادر نہیں ہے اس لیے کبھی کبھی موافق حالات کو پہچان نہیں پاتا اور اس طرح وہ سادگی، جلد بازی یا حماقت کی وجہ سے مستقبل کے ان دیکھے خونخوار جبڑوں کے اندر پہنچ جاتا ہے۔

اللہ دتہ خود ہی پوچھ بیٹھا ـــــ "میرے خلاف کیا کسی نے مخبری کر دی ہے، تمھارے بچے جیئں"۔

پھر خود ہی اس نے جواب بھی دے دیا ـــــ "کہیں وہ بے ایمان عجائب سنگھ تو نہیں ہے؟"

یہاں پر مجسٹریٹ اور پولیس انسپکٹر دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ انسپکٹر نے تو اس سے پوچھ بھی لیا ـــــ "تم عجائب سنگھ کو جانتے ہو؟"

اللہ دتہ کو یقین ہو گیا وہ عجائب سنگھ ہی ہے جس کی وجہ سے وہ اس مصیبت میں پھنسا ہوا ہے بولا ـــــ "تمھارے بچے جیئں، مجھے پہلے ہی شک ہو گیا تھا۔ اب اس نے اپنی بے ایمانی کا ثبوت دے ہی دیا ہے تو میں بھی چپ کیوں رہوں، وہ مجھے قید کرا کے خود کمائی کر لینا چاہتا ہے۔ لیکن تمھارے بچے جیئں، اس معاملے میں کوئی جاسوسی واسوسی نہیں ہے۔ بہت ہی معمولی سی بات ہے۔ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کا معاملہ۔

"میں پیچھے چنیوٹ کا رہنے والا ہوں۔ چنیوٹ ضلع کا۔ ذات کا کمہار ہوں۔ گھڑے مٹکے بنانا نگری نگری بیچنا باپ دادا سے پیشہ چلا آتا ہے پر برا ہو اس پیٹ کا ـــــ (یہاں پر وہ اپنے پیٹ پر دو بار زور سے ہاتھ مارتا ہے) یہ کبھی کبھی تو بہت ہی عجیب عجیب قسم کے کام کرا لیتا ہے۔ میں نے لوگوں کے سروں پر سے پگڑیاں اتارنے اور پھر انھیں بیچ ڈالنے کا ایک انوکھا طریقہ ڈھونڈ نکالا تھا۔

جیٹھ ہاڑ کی سخت گرمیوں میں رات کے وقت بہت سے مسافر لوگ گاڑی کی کھڑکیوں میں ہی سر رکھ کر سو جاتے تھے۔ پگڑیوں سمیت۔ میں خود کئی بار لائل پور سے سرگودھا جاتے ہوئے اسی طرح کھڑکی ہی پر سر رکھ کر سو گیا تھا۔ ایک دن میرے سر پر سے پگڑی کھل کر نیچے جا گری تھی۔ تین سو چھپتر نمبر کی بہت ہی بڑھیا ململ کی کلف لگی پگڑی تھی۔ ہوا کے جھونکے سے ہی گری تھی جس کا مجھے بہت دکھ پہنچا۔ لیکن اس کے گر جانے سے ہی مجھے اس انوکھے طریقے کا خیال آیا۔

ایک رات میں اسٹیشن سے دو کوس دور ایک بانس کے سرے پر کانٹے دار جھاڑی باندھے کھڑا تھا۔ گاڑی کے آنے کے انتظار میں۔ رات کے دو اڑھائی بجے ہوں گے۔ پچھلی پہر۔ نیند کا زور۔ مجھ پر نہیں ـــــ گاڑی میں لدے ہوئے مسافروں پر گرمیوں کی بہار اور ٹھنڈی ہوا کے پھرپھراتے ہوئے جھونکے اور مستی سے چلتی ہوئی گاڑی کی چھک چھک، ماں کی میٹھی لوریوں کا سا مزہ دے جاتی ہے۔

"میں نے دور سے گاڑی کو آتے ہوئے دیکھا تو ـــــ تمہارے بچے جیئیں، میں ایک پیڑ کی آڑ میں سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ انجن کے نکلتے ہی آگے بڑھ کر میں نے بانس سے بندھی کانٹوں دار جھاڑی کو گاڑی کے ساتھ ٹکا دیا۔ جھاڑی گاڑی کے ہر ڈبے کے ساتھ ٹکرائی۔ ہر کھڑکی کے ساتھ اور میرے دیکھتے دیکھتے تیس پگڑیاں پکے ہوئے آموں کی طرح نیچے آ گریں۔ ململ کی، گاڑھے کی، کلف لگی اور رنگی ہوئی میرے تو وارے نیارے ہو گئے، تمہارے بچے جیئیں۔ دو کرتے میں نے بنوائے۔ دو پگڑیاں بھی باندھیں۔ چار کرتے میری گھر والی نے بھی سلوائے سر پر اوڑھنے کے لیے ڈوپٹے بھی بنا ڈالے۔ میرے بچے اور بوڑھے ماں باپ تک نہال ہو گئے۔

"کچھ روز بعد میں نے پھر ویسا ہی کیا۔ پھر تو کئی بار کیا۔ لیکن کچھ دن چھوڑ چھوڑ کر اور جگہ بھی بدل بدل کر۔ یعنی کبھی خانیوال چلا جاتا، اور کبھی شورکوٹ

اور کبھی کبھی تو لالہ موسیٰ جا نکلتا۔ لیکن یہ کام صرف گرمیوں میں ہی کرنا ممکن تھا۔ لوگ صرف گرمیوں میں ہی رات کے وقت کھلی کھڑکیوں میں سر ٹکا کر سوتے تھے۔۔۔۔

"تمہارے بچے جئیں، یہ کام میں نے صوبہ سرحد میں جا کر بھی کیا۔ سنگ جانی، ٹیکسلا، ملکی مروت، اور کوہاٹ کی طرف جا کر۔ وہاں تو پٹھان لوگ ریشمی اور مشہدی پگڑیاں باندھتے تھے۔ جنھیں بیچ بیچ کر میں نے جی بھر کر کمایا۔ لیکن پاکستان بنتے ہی حالات بدل سے گئے۔ سروں پر جناح کیپ لگانے کا رواج عام ہو گیا۔ اچھے بھلے باعزت لوگ بھی پگڑی چھوڑ کر ٹوپی پہننے لگے۔ جیسے پلیگ۔۔۔ یا ہیضے کی بیماری پھیل جاتی ہے نا! تو لوگ کس طرح بڑی تعداد میں آناً فاناً مرنے لگتے ہیں۔ ٹوپی لگانا بھی ایک بیماری ہی تو تھی۔۔ جسے دیکھ دیکھ کر مجھے غصہ آتا۔ پگڑی کے ساتھ آدمی کا چہرہ اور ہوتا ہے اور ٹوپی کے ساتھ بالکل ہی دوسرا۔۔۔۔ ٹوپی کے ساتھ کسی کو دیکھ کر یہ اندازہ کبھی نہیں ہو پاتا کہ وہ آدمی پیسے والا ہے یا بالکل ہی پھکڑ۔۔۔ عزت اور پیسے کا نشان ٹوپی نہیں ہو سکتی۔ خیر۔۔۔ تمہارے بچے جئیں اس طرح میرا بہت نقصان ہوا۔۔۔۔ میں پولیس کی پکڑ سے دور، بڑے اطمینان سے کبھی کبھی یہاں وہاں مہینے میں دو چار وارداتیں کر کے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے کچھ نہ کچھ بنا لیا کرتا تھا لیکن اب تو کبھی کبھی ہی کوئی پگڑی ہاتھ لگتی تھی۔ لوگوں کو ننگے سر رہنے کی لت سی پڑ گئی تھی۔۔۔۔

"میں کئی سال تک بیکار رہا۔ ایک روز میرے دل میں ہندوستان آنے کا خیال آیا۔ مجھے معلوم تھا میرے ایک دو ملنے والے راجستھان گئے ہوئے ہیں۔ سوچا اسی بہانے وہاں سے کچھ پگڑیاں گرا لاؤں گا۔ میں نے پاسپورٹ بنوایا اور راجستھان پہنچ گیا۔ راجپوت لوگ تو بڑی بڑی پگڑیاں باندھتے ہیں۔ اس لیے دیکھنے میں بھی وہ بہت رعب دار لگتے ہیں۔ پگڑی کی تو دھج ہی نرالی ہوتی ہے تمہارے بچے جئیں۔

راجپوتوں کو دیکھ دیکھ کر میرا تو دل خوشی سے بھر بھر آتا تھا۔ جی چاہتا ایک ایک پگڑی والے کو گلے سے لگاتا پھروں۔ راجستھان میں گاڑیوں میں بھیڑ بھی بہت رہتی ہے۔ اکثر لوگ لٹک کر سفر کرتے تھے۔ ان سب کی پگڑیاں میری کانٹے دار جھاڑی کے ساتھ لگ کر گر جاتیں جنھیں میں کبھی اچھے داموں، کبھی معمولی داموں پر بیچ ڈالتا تھا۔ مجھے ڈر بھی لگتا کیوں کہ میں ایک غیر ملک میں آکر اپنا دھندا کر رہا تھا۔ لیکن چوں کہ پگڑیاں آسانی سے مل جاتی تھیں اس لیے میرا حوصلہ بڑھتا گیا۔ بیکانیر، گنگا نگر، اودے پور، ہر جگہ میں پہنچا۔ ہر سال گرمیوں میں دس بیس دنوں کے لیے چلا آتا تھا۔ راونجنا، ڈونگر ڈاکوؤں کا علاقہ ہے۔ یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی۔ وہاں ایک رات ڈاکوؤں نے مجھے گھیر لیا۔ اس وقت میں پوری پونجی اس پگڑیوں کا گٹھر سر پر اٹھائے خوشی سے گاتا جھومتا ہوا چلا آرہا تھا۔ ڈاکوؤں نے مجھے بیوپاری سمجھ کر آگے لگا لیا۔ بہت مارا بھی۔ کہتے تھے گھر بار کا پتہ بتاؤ اور اپنے رشتے داروں کے نام خط لکھو کہ وہ تمھارے چھڑانے کے لیے دس ہزار روپے لے کر آئیں۔ ہزاروں قسمیں کھانے کے بعد کہیں انھیں یقین دلا پایا کہ میں بھی انہی کا بھائی بند ہوں۔ ایک رات انھیں اپنے ساتھ لے جاکر پگڑیاں گرا کر دکھائیں، تو وہ بہت خوش ہوئے۔ خوب ہنسے، لیکن ہنستے ہنستے انھوں نے مجھے دھنک کر بھی رکھ دیا۔ مار مار کر میرے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالے۔ تمھارے بچے جئیں، انھوں نے مجھے وہاں سے بھگا دیا۔ کہا، پھر تو نے اس طرف قدم بھی رکھا تو جان ہی سے مار دیں گے۔

"اس کے بعد سے میں نے راجستھان کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ اس کے بعد تو میں نے پنجاب کو اپنا اڈا بنا لیا۔ کیوں کہ اب اور کہیں کامیابی کی امید نہیں ہو سکتی تھی۔ پاکستان کی طرح یہاں بھی بہت سے لوگ ننگے سر رہنے کے

عادی ہیں یا پھر گاندھی ٹوپی پہنتے ہیں. گاندھی ٹوپی میں سب کچھ چھپا رہتا ہے۔ کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ نہ صاف صاف انسان کی شرافت نہ ہی اس کی مکاری۔ اسی لیے راجستھان سے مایوس ہو کر میں نے پنجاب کا انتخاب کیا۔۔۔ پنجاب تو تمھارے بچے جئیں، پگڑیوں کا ہی ایک خاص الخاص صوبہ ہے!

"پہلے پہل مجھے زیادہ حوصلہ نہیں ہوا۔ بہت ڈر لگتا تھا نا ۔۔۔۔ کہیں سکھ لوگ پکڑ کر جھٹکا ہی نہ کر دیں۔ لیکن جب عجائب سنگھ کے ساتھ دوستی مجھے ہو گئی تو سارا خوف دور ہو گیا۔ وہ ہال بازار میں پگڑیاں اور دوپٹے رنگنے کا کام کیا کرتا ہے۔ رنگریز ہے نا۔ اس کے ذریعے سے کچھ عرصہ خوب پگڑیاں بیچیں۔ لیکن بعد میں وہ ایک دن بے ایمان ہو گیا ۔۔۔۔ بولا، اب یہ دھندہ میں خود کیا کروں گا۔ تمھاری کوئی ضرورت نہیں۔ تم ہمارے ملک سے نکل جاؤ نہیں تو پکڑوا دوں گا۔

تمھارے بچے جئیں ۔۔۔۔ سارا قصہ اتنا ہی ہے بھلا بتاؤ ۔۔۔۔ اس میں جاسوسی واسوسی کونسی ہو گئی جس کے لیے مجھے خواہ مخواہ پھانسا جا رہا ہے۔ تمھارے بچے جئیں!"

برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید
آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں
مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب
کے حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو
جوائن کریں
ایڈمن پینل :
محمد ثاقب ریاض : 03447227224
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067
Imagitor

تمھارا فیصلہ کیا ہے؟

پورے پندرہ دن کے بعد لاجونتی کا شوہر گھر لوٹا تھا۔ وہ اندر کمرے میں سو رہا تھا لاجونتی خوش تھی۔ اپنے شوہر کے خلاف سارا غم و غصہ بھول کر جلدی جلدی آنگن کی صفائی کر رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے جاگنے سے پہلے ہی سب کاموں سے فرصت پالے ان تمام کاموں سے جو ہر صبح ہوتے ہی ایک عورت کے سامنے آجاتے ہیں۔ اور ان میں کبھی کمی نہیں ہوتی۔

اس نے آنگن، برآمدہ، تینوں بڑے کمرے اور باورچی خانہ صاف کر چکنے کے بعد، رات کے جھوٹے برتنوں کی طرف توجہ کی پھر چولہے کی راکھ کو کرید کر لکڑیوں پر تیل ڈالا اور پھر اُن میں کوئلے رکھ دیے۔ کوئلے دہکنے لگے تو کیتلی میں چائے کے لیے پانی ڈال کر اُسے اوپر رکھ دیا۔ پھر آٹا گوندھنے بیٹھی ہی تھی کہ بچوں کو جگانے کا وقت ہو گیا۔ انھیں تیار کر کے اسکول بھیجنا تھا۔ جلدی سے اندر پہنچی اور ان کے اوپر سے لحاف اتارا انھیں اُٹھایا۔ اور جب دیکھا اور روی اپنے پلنگ سے

اتر کر فرش پر کھڑے آنکھیں مل رہے تھے تو وہ یہ کہتی ہوئی باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی "اب پھر بستر پر نہ لیٹ جانا آٹھ بج چکا ہے۔ اگر ذرا بھی سستی کی اور اسکول پہنچنے میں دیر ہوگئی تو میں ناشتہ نہیں دوں گی۔ ایسے ہی جانا ہوگا سمجھے!" کچھ دیر تک وہ آٹا گوندھتی رہی۔ جب اس نے اپنے بچوں کی باتوں سے یہ اندازہ لگایا کہ وہ اپنے پاپا کے اچانک گھر لوٹ آنے سے حیران ہو رہے ہیں۔ اور انہیں جگانے کا فیصلہ کر رہے ہیں تو انہیں وہیں سے ڈانٹ بتائی "اے روی، ریکھا! میری بات سنو۔ پاپا کو مت جگانا۔ وہ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ اپنا اپنا برش اٹھا کر غسل خانہ میں جاؤ۔" بچے باہر آگئے اپنا اپنا برش اور تولیہ اٹھا کر روی نے پوچھا "ماما! پاپا میرے لیے فٹ بال لائے ہیں؟" ریکھا بول اٹھی "انھوں نے کہا تھا، تمھارے لیے سائیکل لائیں گے۔"

لاجونتی نے غسل خانے میں جا کر نل کھول دیا۔ جو دونوں بچوں کی پہنچ سے بہت اونچا تھا۔ اور پھر باورچی خانے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی "کچھ بھی نہیں لائے۔ یہی غنیمت کہ خود آگئے ہیں؟"

چائے کا پانی کھول رہا تھا اسے اتار کر اس میں چائے کی پتی ڈال دی۔ پھر دودھ کی پتیلی آگ پر رکھ دی۔ دھوتی کے پلّو کو کمر کے گرد لپیٹا اور بار بار کھلتے ہوئے لمبے لمبے بالوں کا پھر سے کس کر جوڑا باندھا اور پھر کمرے میں یہ دیکھنے چلی گئی کہ اس کا شوہر کہیں جاگ تو نہیں گیا۔ اس کا شوہر گردن تک لحاف اوڑھے ایک بازو سے منہ چھپائے گہری نیند میں ڈوبا ہوا خراٹے لے رہا تھا۔ بڑھتی ہوئی شیو اور بکھرے ہوئے بال میں اس کا چہرہ اور سرخ جلد چمک رہی تھی۔ لاجونتی نے آگے بڑھ کر کرسی کے پشت پر پڑے ہوئے کوٹ اور پتلون اٹھا کر دیوار پر لٹکا دیے۔ اور باورچی خانے میں جانے سے پہلے ایک بار سر گھما کر اپنے خاوند کو دیکھا۔ لاجونتی

کی آنکھوں میں بیٹھی یادوں کی پھیلتی ہوئی لکیریں تھیں اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ پڑوسیوں کے طعنوں کی ذرا بھی پروا نہیں کرتی۔

اُدھر سیر کی بیوی نے کہا تھا "تمھارا شوہر جتنا روپیہ کماتا ہے سب ایک رنڈی کی نذر کر دیتا ہے۔"

دیانند اکسائز انسپکٹر نے ایک دفعہ خود آ کر کہا تھا "بھابی! اوپر کی آمدنی کا یہ مطلب نہیں کہ خود غرض دوستوں کو شراب پلا پلا کر برباد کر دی جائے۔ روپیہ میں بھی کماتا ہوں۔ لیکن ہوش و حواس تو نہیں کھوتا۔ بھگوان نے چاہا تو اگلے سال اس فلیٹ کو چھوڑ کر اپنے نئے مکان میں جا رہوں گا جو لیشیر گنج میں بنوا رہا ہوں۔"

یہ سب سچ تھا اور جو باتیں وہ سب نہیں کہتے تھے وہ بھی جانتی تھی۔ ہمیشہ رو رو کر اور گھل گھل کر دن گزارے تھے۔ یہ پندرہ دن جو اس کے شوہر نے بغیر کچھ کہے سنے باہر گزارے تھے اس نے بڑی دشواریوں سے کاٹے تھے کیوں کہ اس درمیان راشن ختم ہو گیا تھا اور اُسے نوکر کو جواب دے دینا پڑا تھا۔ اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ پہلے کی سی آسانی سے خرچ چلاتی۔ اور جیسا لوگ کہا کرتے تھے کہ وہ اسے چھوڑ دے گا۔ اس نے اس بار یقین ہی کر لیا تھا۔ لیکن کل رات دو بجے اچانک جب وہ واپس آ گیا تو وہ اب سب کچھ بھول رہی تھی۔ اپنا غم، اپنا غصہ اپنی شکایتیں سب کچھ وہ اس طرح اس کے بازوؤں میں سمٹ گئی تھی جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

اب اسے صرف ایک فکر تھی کہ وہ اس کے کھانے کے لیے کیا بنائے؟ کئی دنوں سے وہ بچوں کو معمولی کھانا دے رہی تھی۔ ترکاری اور گوشت پکائے کئی دن گزر گئے تھے۔ آج اس نے مارکیٹ جا کر سب چیزیں لانے کا فیصلہ کر لیا۔

رِدی نہانے کے بعد قمیص اور نیکر پہن کر آ رہا تھا۔ لاجونتی نے جلدی جلدی

ریکھا کے بال بنائے اس میں ربن لگایا اور پھر دونوں کو اپنی اپنی کتابیں ٹھیک کرنے کا حکم دیتی ہوئی باورچی خانے میں جا بیٹھی۔

روی نو سال کا تھا۔ ریکھا چھ سال کی تھی۔ دونوں نے اپنی کتابیں لا کر آنگن میں تخت پر رکھ دیں اور باورچی خانے میں ناشتہ کرنے چلے گئے۔

لاجونتی ان کے سامنے ناشتہ رکھ کر خود کپڑے بدلنے اندر چلی گئی۔ پچھلی رات کی میلی ساری اتار کر سفید شلوار اور نیلی چھینٹ کی ریشمی قمیص پہن لی اور پیازی رنگ کا دوپٹہ کاندھے پر ڈال کر بالوں کو پھر سے کس کر جوڑا باندھتے ہوئے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ بندھے ہوئے بالوں پر ذرا کنگھی پھیری اور پھر ہاتھ میں خالی تھیلا اٹھا کر شوہر کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"میں نے کہا سنتے ہو؟"

اُس کے شوہر نے پہلو بدل کر منہ پھیر لیا۔

سنو تو۔ میں بازار جا رہی ہوں۔"

"اوں!"

"میں روی اور ریکھا کو اسکول چھوڑ کر مارکیٹ چلی جاؤں گی۔ آپ کے لیے آج گوشت لاؤں گی۔ تب تک آپ نہا لیجیے۔ آج پہلی تاریخ بھی ہے دس بجے جا کر تنخواہ بھی لے آیئے۔ تاکہ بارہ بجے تک راشن لانے کا انتظام ہو سکے سُنا آپ نے؟"

اس کے شوہر نے کوئی جواب نہ دیا۔ لاجونتی نے دیوار پر لٹکے ہوئے اس کے کوٹ میں ہاتھ ڈالا۔ صرف دو آنے نکلے۔ انھیں وہیں ڈال دیا۔ اور باورچی خانے میں جا کر چینی کے ڈبے میں سے کچھ ریزگاری نکالی۔ جسے وہ اپنے شوہر سے چھپا چھپا کر رکھنے کی عادی تھی۔ وہ بچوں کو لے کر باہر نکل آئی۔ باہر کے دروازے کو آہستہ

سے بند کیا اور قیصر باغ کے چوراہے کی طرف بڑھی۔ روبی اور ریکھا اس کے دائیں بائیں اپنے اپنے بیگ کندھوں سے لٹکائے چل رہے تھے۔ اس نے روبی کے سوئٹر کو ایک جگہ سے چھو کر دیکھا جہاں وہ اُدھڑا ہوا تھا۔ بولی "آج تمہارے پاپا تنخواہ لے آئیں گے تو تمھیں ایک نیا سوئٹر بن دوں گی"۔

"ممی میرا سوئٹر؟" ریکھا نے اپنی تنگ گرم فراک میں سکڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں۔ تمھیں بھی۔ پہلے تنخواہ تو آئے۔ کتنی ہی چیزیں خریدنا ہیں"

"ممی ہمارے پاپا تو ہماری اتنی پرواہ نہیں کرتے جتنا تم کرتی ہو!" روبی نے قریب اسے چپٹتے ہوئے کہا۔

"یہ تم کیسے کہتے ہو بیٹا! انھیں تمھارا خیال نہ ہوتا تو وہ گھر کیوں لوٹ آتے؟"

"ممی! وہ چلے کہاں جاتے ہیں؟ وہ بہت کم گھر پہ رہتے ہیں!"

"میں کیا جانوں! اپنے پاپا سے پوچھنا"

لاجونتی نے بچوں کو امین آباد کی کراسنگ پر چھوڑ دیا۔ اور خود قیصر باغ کی مارکیٹ میں لوٹ آئی۔ آدھ سیر مٹر لیے آدھ سیر ٹماٹر۔ اور سیر بھر پیاز۔ تھیلہ کافی بڑا تھا۔ دو قسم کی ترکاریاں لیں۔ دوسرے دن کے ناشتے کے لیے ڈبل روٹی اور آدھے درجن انڈے بھی لیے۔ پیسے ختم ہو گئے تھے۔ تھیلہ بھر گیا تھا۔ کچھ چیزیں اسے ہاتھ میں اٹھانی پڑیں۔ دونوں ہاتھوں میں سامان لادا، وہ جلدی جلدی گھر لوٹی۔

تیس سال کی حسینہ، لمبے پتلے مگر تندرست جسم کی لاجونتی گھر لوٹتے وقت سوچتی چلی آرہی تھی کہ اگر اس کے پاس ایک روپیہ اور ہوتا تو وہ میٹھے ٹوسٹ بنانے کے لیے بالائی بھی خرید لاتی۔ وہ چاہتی تھی کہ آج خاوند کو بہت بہترین قسم کا کھانا کھلائے۔ میٹھے ٹوسٹ وہ بڑے چاؤ سے کھاتے ہیں۔

واپس آنے میں اُسے آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ جب وہ نٹراج سینما کے سامنے سے گزری تو دھوپ کافی پھیل چکی تھی۔ سینما کے اشتہار بانٹنے والے نیند سے تھکے ہوئے شہر کا چکر لگانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سڑک پر دفتر اور کالجوں کو جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے فلیٹ کے نیچے پرانے فرنیچر کے دکاندار سے اپنے اس قالین کے متعلق پوچھا جو اس نے اسے کئی دن پہلے فروخت کرنے کی غرض سے دیا تھا۔ اور پھر اس سے "ہاں وہ آگئے ہیں۔ سوئے ہوئے ہیں" کہتی ہوئی اوپر چلی آئی۔

اس نے کنجی کے سہارے دروازہ کھولا۔ آنگن سے گزرتے ہوئے باورچی خانے کی طرف گئی۔ تمام چیزیں اس نے خوشی خوشی رکھ دیں۔ انگیٹھی میں پتھر کے کوئلے خوب سرخ ہو رہے تھے۔ اس نے جلدی سے پیاز کاٹی گھی ڈال کر مسالہ بھونا گوشت دھونے کے لیے نل کی طرف لپکی اور اچانک اسے یوں لگا جیسے کمرے میں اس کا شوہر موجود نہیں ہے۔ اچانک ہی یہ خیال اس کے ذہن میں ابھرا اور اس کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ وہ گوشت کا برتن لیے ہوئے اندر چلی گئی۔ پلنگ خالی تھا۔ اس نے دوسرے پلنگ پر نظر ڈالی۔ وہ وہاں کیسے ہوتا! اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جوتوں کے ریک میں سے راؤنڈ ہیڈ کے جوتے غائب تھے۔ وہ ضرور چلا گیا ہوگا۔ اسے میں نے بتا دیا ہے کہ آج گھر پر راشن نہیں ہے۔ اس نے گھر کی بری حالت کا خود ہی اندازہ لگایا ہوگا۔"

بجلی کا خرچ بچانے کے لیے اس نے کیروسین لیمپ جلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے دل کو تسلی دیتی ہوئی پھر نل پر چلی گئی۔ گوشت دھویا۔ لیکن اس کے ہاتھوں سے وہ پھرتی غائب ہو گئی تھی۔ جو اسے کچھ دیر پہلے ایک مشین بنائے ہوئے تھے۔

لاجونتی اور اس کے بچوں نے شام تک راہ دیکھی۔ پھر رات آگئی۔ جوں جوں رات گہری ہوتی گئی ان کی مایوسی بڑھتی گئی۔ اس کے شوہر کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ اس

نے پڑوسیوں سے بھی اس کے متعلق کچھ نہ پوچھا۔ وہ جانتی تھی وہ لوگ ہمدردی کے بجائے اس کا مذاق اڑائیں گے۔

اس کا خاوند تنخواہ لے کر پھر غائب ہو گیا تھا۔ بالکنی میں کرسی کے نزدیک کیروسین لیمپ رکھے ربیھا کی فراک پر اسموکنگ کرتے ہوئے اس نے اپنے شوہر کی بُرائیوں پر نظر ڈالی۔

اوپر کی آمدنی نے اس کی عادتوں کو بگاڑ دیا تھا۔ اس آمدنی کی وجہ سے گھر کی فاضل مدوں میں اس قدر اضافہ ہو گیا تھا کہ جب شوہر نے مدد کرنا بالکل ہی بند کر دیا تو اسے اُن خرچوں کو کم کرنے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا شوہر کورٹ انسپکٹر تھا۔ وہ محض اس نوکری ہی کی وجہ سے بُرائی کا شکار نہ ہوا تھا بلکہ اب سے بہت پہلے غیر منقسم پنجاب میں بھی جب وہ ملٹری کے ایک انسپکشن ڈپو میں سپروائزر تھا (تب ہی اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی) وہ دونوں ہاتھوں سے روپیہ لوٹ رہا تھا۔ کون تھا جو اس کے متعلق جانتا نہ ہو۔ لوگ کہتے تھے جس نے پہلے کبھی دولت کا منہ نہ دیکھا ہو وہ اسے پا کر اندھا ہو جاتا ہے۔ وہ حقیقت میں اندھا ہی ہو گیا تھا۔

اچانک اس پر مقدمہ چل گیا۔ مقدمہ دو سال تک چلتا رہا۔ جتنا روپیہ کمایا تھا اس کا بیشتر حصہ مقدمہ بازی کی نذر ہو گیا۔ یہی بڑی بات تھی کہ وہ مقدمے سے بری ہو گیا جتنا روپیہ بچایا تھا۔ وہ بھارت آ کر "لا" پڑھنے میں خرچ کیا۔ جب وہ تعلیم حاصل کر رہا تھا تب دولت کمانے کی تمنا اس کے دل میں موجود تھی۔ وہ کہا کرتا تھا "وکیل بن کر بھر لاکھوں روپے کماؤں گا۔ اس میں کوئی کھٹکا تو نہ ہو گا۔ ایمان داری کی کمائی ہو گی۔ سو فی صدی ایمان داری کی" لیکن وکالت نہ چلی۔ نوبت فاقوں تک آ پہنچی تو اس نے مختار کار کی جگہ لے لی۔ کچھ نہ کچھ اوپر کی آمدنی بھی ہونے لگی۔ تنکر خور کو

تنکر مل ہی جاتی ہے۔ قسمت میں ترقی کا ایک اور موقع لکھا تھا۔ افسروں سے مل کر کورٹ انسپکٹر مقرر ہو گیا۔

لاجونتی سوچ رہی تھی۔ اپنے شوہر کے کردار کو بگاڑنے میں خود اس کا بھی ہاتھ تھا۔ اس نے پوری سچائی سے اپنے کردار پر بھی نظر ڈالی۔ گزشتہ بارہ سالوں میں اس نے ایک بار بھی اس قسم کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ جو اس کے شوہر کو پستی کے گڑھے میں گرنے سے بچا سکتی۔ جب تک وہ اسے جی کھول کر خوش کرنے کا موقع دیتا رہا اس نے کبھی بھی برے دنوں کے متعلق نہیں سوچا۔ اب جب کہ وہ اسے کچھ بھی نہیں دیتا اور اپنا سب کچھ کسی دوسری عورت کی گود میں جا کر ڈال دیتا ہے تو وہ بیٹھی آنسو بہا رہی ہے، جتنا روپیہ اس نے بچا کر رکھا تھا۔ دھیرے دھیرے ختم ہو رہا تھا۔ اب صرف چند زیورات بینک میں محفوظ تھے۔ اسے صرف ان کی وجہ سے تھوڑا سا اطمینان تھا کہ وہ بچوں کی تعلیم وغیرہ کے کام میں آ سکیں گے۔ یہ سوچتے سوچتے اس نے فراک ہاتھ سے رکھ دی اور جلدی سے اس ٹرنک کو کھولنے لگی جس میں سیف ڈپازٹ کی کنجی رکھی تھی، اس نے تمام کپڑے الٹ پلٹ دیے اس کی پیشانی پر ٹھنڈے پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔ اس نے گھبرا کر دوسرا اٹیچی اور سوٹ کیس بھی چھان ڈالے جن کے متعلق اسے یقین تھا کہ کنجی ان میں نہیں رکھی گئی تھی۔ وہ ہاتھوں سے سر تھام کر سسکنے لگی۔ نان پارہ ہاؤس کے چھ کمروں والے فلیٹ میں اس رات وہ بالکل ہی بے سہارا تھی۔ اس کے پاس چینی کے ڈبے میں صرف تین روپے نو آنے پڑے تھے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک جہنم منہ کھولے کھڑا تھا۔ اس کا یا اس کے خاوند کا کوئی ایسا بھائی بھی نہیں تھا جس کے پاس وہ جا کر بھیک مانگ سکتی۔

ں کے رونے کی آواز سن کر رودی اور ریکھا جاگ پڑے۔ اور حیرانی سے ماں

کے پاس آکر کھڑے ہو گئے کھلے ہوئے ٹرنک اور سوٹ کیس دیکھ کر رومی نے پوچھا۔
"ممی یہ کیا ہوا؟ کون آیا تھا؟"

یہ سن کر لاجونتی کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں سے کسی نے پکار کر ایک چور کا نام لینا چاہا۔ لیکن اس نے اس آواز کو خاموشی سے دبا دیا، اپنی سسکیاں روک لیں۔ اپنے آنسو پونچھ لیے اور بکھری ہوئی چیزوں کو سمیٹتے ہوئے بولی۔

"کوئی نہیں آیا تھا۔ تم چلو۔ جاکر سو جاؤ۔ میں آتی ہوں۔"

دوسرے دن صبح اس نے بچوں کے ساتھ مل کر باسی کھانا کھایا۔ اسی وقت اوپر سے ساتھ کے فلیٹ میں رہنے والا دیانند آگیا۔ وہ سمجھ گئی کہ ضرور کوئی خبر لایا ہوگا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بچے اس خبر کو سنیں۔ لیکن اس نے آتے ہی کہہ ڈالا "بھائی اس نے تو ایک مہینے کی چھٹی لے لی ہے اور اس رنڈی کو لے کر کانپور چلا گیا ہے۔"

"رنڈی کون ہے امی؟" رومی نے کھانے سے ہاتھ روک لیا۔

لاجونتی نے بے بس ہو کر اس کے منہ پر طمانچہ مارا اور چیخ کر بولی "ہزار بار تمہیں کہا ہے، اپنے کام سے کام رکھا کرو۔"

رومی کھانا چھوڑ کر روتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ریکھا سہمی ہوئی تھالی میں ہاتھ رکھے بیٹھی رہی۔ لاجونتی روتی ہوئی اٹھ پڑی اور دیانند سے بولی "تم جھوٹ بولتے ہو۔ میں نے تم سے کئی بار کہا ہے کہ میرے سامنے ایسی باتیں مت کیا کرو۔ آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟"

لاجونتی کو روتا دیکھ کر دیانند چپ چاپ واپس چلا گیا۔ وہ اندر جاکر رومی کو منانے لگی "چلو بیٹا کھانا کھالو۔ چلو نا اچھے بچے رویا نہیں کرتے۔"

ایک ہفتہ گزر گیا اس درمیان اس نے اڑوس پڑوس سے کئی باتیں سنیں۔ سب سے زیادہ زہریلی بات سنیما کے منیجر اندر سنگھ کی ماں نے کہی۔ اس عورت

میں اب رکھا ہی کیا ہے۔ نہ شکل، نہ صورت۔ اس کا گورا رنگ ہی پہلے گوا دیا۔ رنگینی ہی بس میں رکھ سکتی ہے۔"

اس دن اس نے اپنے آپ کو آئینے میں غور سے دیکھا۔ اس کے گال پچک گئے تھے۔ آنکھیں بے نور ہو گئی تھیں۔ اس کے ہونٹ اور اس کے بال بھی اپنی چمک دمک کھو بیٹھے تھے۔ پتلا جسم اب کسی بھی وقت لڑکھڑا کر گر پڑنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ بچوں کی طرف سے لاپرواہ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ ان کی تعلیم اور پرورش کے لیے ہر قسم کا بلیدان کرنے کے لیے تیار تھی۔ اب مکان کا کرایہ دینا ممکن نہ تھا۔ اس نے فرنیچر والے دکان دار کو اپنا سارا سامان دکھایا اور اس کے اونے پونے دام لے کر دکان تبدیل کر لیا۔ ایک تنگ اور اندھیری گلی میں ایک کمرہ پندرہ روپے ماہوار پر مل گیا۔ اس میں نہ روشنی کا گزر تھا نہ ہوا کا۔ ایک سیونگ مشین جو اس نے نہیں بیچی تھی، اس کے کام آنے لگی۔ اڑوس پڑوس سے کپڑے سینے کے لیے مل ہی جاتے تھے۔

ایک دن بچوں کی فیس دینے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ روی چلا کر بولا "ممی اس بار تم نے پاپا کو اس گھر میں پاؤں بھی رکھنے دیا تو اچھا نہ ہوگا۔"

لاجونتی نے اس کی طرف غم زدہ ہو کر دیکھا۔ دس سال کی عمر میں یہ بچہ حالات کو کتنی تیزی سے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن وہ کتنی کڑوی بات کہہ رہا ہے۔ اپنے باپ کو گھر میں داخل نہیں ہونے دے گا۔ جیسے اس کا باپ سچ مچ ہی آنے والا ہو۔ سال بھر ہو چکا تھا اور اس نے لوٹ کر کوئی خبر بھی نہ لی تھی۔ لاجونتی نے اپنے آنسو پی کر روی کے گال پر پیار سے ہلکا سا تھپڑ مارتے ہوئے کہا "پاگل کہیں کا۔"

روی نے ماں کا ہاتھ روک لیا اور بولا "ممی! تم کسی اسکول میں نوکری کیوں نہیں کر لیتیں؟"

"نہیں! میرے بچو! اب میں اتنی بڑی ہو گئی ہوں کون نوکری دے گا مجھے؟"

ردی سوچ کر بولا "ممی! ہمارے اسکول کے پاس ایک بک اسٹال ہے۔ میں اگر روزانہ کچھ وقت نکال کر اس سے کمیشن پر اخبار اور رسالے بیچا کروں گا تو کم سے کم میری اور ریکھا کی فیس کے پیسے تو نکل ہی آئیں گے۔"

ماں کو خاموش دیکھ کر روی نے میلی پھٹی نیکر کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اچھا ممی! میں جاتا ہوں۔ آج سے یہی کام ہوگا۔ فیس کے لیے پیسے بن گئے۔ اب اسکول جائیں گے۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی "باہر دیکھو تو کون ہے؟"

وہ لپک کر باہر گیا اور تھوڑی دیر بعد لوٹ کر بولا "جانے کون ہے! میں نے پہلے کبھی اسے نہیں دیکھا۔ کہتا ہے اپنی ممی کو بلاؤ؟"

لاجونتی نے ریکھا کو گود سے الگ کیا اور دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر اس آدمی کی طرف دیکھا ادھیڑ عمر کا کھچڑی بالوں پر پرانا بوسیدہ سا ہیٹ جمائے۔ ایک پرانا نیلا کوٹ پہنے۔ سائیکل تھامے کوئی کھڑا تھا۔ سائیکل کے پیچھے کیرئیر پر بہت ساری فائلیں بندھی ہوئی تھیں کچھ لمحے غور سے دیکھنے کے بعد اسے پہچان گئی۔ اور سامنے آکر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی "آیئے۔ آیئے، نمستے!"

اس آدمی نے مسکرا کر بھاری مگر میٹھے محبت بھرے لہجے میں کہا "کہو لاجونتی! مجھے پہچانا کہ نہیں؟"

"جی پہچان لیا آیئے اندر آجایئے نا" لاجونتی سر جھکا کر دروازے سے ہٹتے ہوئے بولی۔ اس آدمی نے سائیکل ڈیوڑھی میں کھڑی کر دی اور ریکھا کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"یہ تمہارے بچے ہیں؟"

لاجونتی نے اندر جا کر ایک ٹرنک پر کپڑا بچھا کر اس کے بیٹھنے کی جگہ بنا دی۔ وہ بیٹھ کر بولا "کل میں ادھر سے گزرا تو تمھیں سامنے سڑک کے نل سے پانی بھر کر اندر آتے ہوئے دیکھا۔ میں نے سوچا ہے تو لاجونتی ہی! پندرہ سال کے بعد تمھیں دیکھا تھا۔ یاد ہے جب تم اسکول میں پڑھتی تھیں۔ میں اور تمھارا بھائی ہیرالال تمھیں تمھارے اسکول پہنچا کر اپنے اسکول جایا کرتے تھے۔ ہاں وہ وقت تھا۔ سچ مچ وہ کتنا اچھا زمانہ تھا۔ لاجونتی! ہیرالال میرا گہرا دوست تھا۔ بے چارہ پاکستان بنا لیکن لاکھوں کے گھر اجڑ گئے۔ لاکھوں کے۔"

لاجونتی کے آنسو نکل پڑے۔ اس آدمی نے روی کو اپنی باہوں میں لے لیا۔ اور سر سے ہیٹ اتار کر پاؤں کے پاس رکھتے ہوئے بولا "تم رو رہی ہو لاجونتی! میرے آنسو تو جل گئے! تمھیں معلوم ہے۔ میری بیوی، میرے بچے۔ میرا سارا خاندان فرقہ وارییت کی بھینٹ چڑھ گیا! مگر تم سچی ہو تمھیں ایک آگ سے نکال کر دوسری آگ میں دھکیل دیا گیا ہے۔ کل گھنشیام ملا تھا۔ اس نے تمھارے بارے میں سب کچھ بتایا اور آج میں یہاں آئے بنا نہ رہ سکا۔ وہ انسان کتنا عجیب ہے جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر وہاں سے تمھیں بچا لایا لیکن اس نے یہاں آکر بالکل بے سہارے چھوڑ دیا۔ ایسا چھوڑا کہ پھر کبھی خبر تک نہ لی۔ مجھے ملے تو مار مار کر تنبیہ درست کر دوں! نالائق کہیں کا! چار پیسے کیا کمائے دماغ ہی خراب ہو گیا! سچ ہے۔ خدا گنجے کو ناخن نہ دے!"

لاجونتی نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا "آپ یہاں کب آئے؟"

"میں؟ میں تو یہاں چھ سال سے ہوں۔ یہاں رفیوجی انسپکٹر ہوں شرنارتھیوں کے کلیم وغیرہ دیکھتا ہوں۔"

"آپ کی ایک لڑکی بھی تھی۔ اس کا کچھ پتہ چلا؟"

"کہاں پتہ چلا؟" اس نے ایک ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ "پتہ چلتا تو میں یوں مارا مارا کیوں پھرتا؟ سچ کہتا ہوں بچوں کو پیار کرنے کے لیے ترس گیا ہوں۔ جب کسی کا بچہ میرے نزدیک آجاتا ہے تو جی چاہتا ہے اسے سینے سے لگا لوں اور پھر علیحدہ نہ کروں۔ لیکن میری قسمت ہی ایسی ہے۔ کسی کا کیا قصور۔ میرے جیسے ہزاروں انسان ہندو بھی اور مسلمان بھی آج آزادی کا نام سن کر ایک عجیب سی بے بسی سے ادھر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد وہ آدمی چلا گیا تو روی نے اس کا نام پوچھا۔ لاجونتی بولی "حافظ آباد میں یہ ہمارے پڑوسی تھے۔ ان کا نام نندن لال ہے۔"

"بڑے اچھے معلوم ہوتے ہیں!" ریکھا نے کہا۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ روی اور ریکھا کے پیچھے لاجونتی بھی پہنچی۔ کندن لال اپنے ہاتھوں میں مٹھائی اور بسکٹوں کے پیکٹ لیے کھڑا تھا۔

"ان کی کیا ضرورت تھی!"

"یہ بچے کھائیں گے۔ آؤ روی لے لو بیٹا یہ۔ مجھ پر بھی تم لوگوں کا حق ہے۔"

کندن لال اپنی بھاری میٹھی آواز میں ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔ روی نے بسکٹ کا پیکٹ کھولتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارے پاپا نے کیا سچ مچ ہی ہمیں چھوڑ دیا ہے؟"

لاجونتی نے اسے گھورا، نادان کہیں کا! ابھی کچھ دیر پہلے وہ اپنے پاپا کے لیے گھر کے دروازے بند کر رہا تھا۔

روی رک گیا۔ اس نے بسکٹ کا پیکٹ ہاتھ سے رکھ دیا اور ماں کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"یہ بسکٹ اور مٹھائی ہمارے کس کام کے؟ ان ہاتھوں نے ہمیں اسکول کی فیس

دے دی ہوتی!"

لاجونتی نے اس کی طرف دکھی ہو کر دیکھا اور بولی "روی تم ابھی اٹھو اور اس بک اسٹال پر جاؤ۔"

"اچھا ماں!" روی اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

"روی کہاں جا رہا ہے ممی؟" ریکھا نے ماں کے نزدیک کھسک کر پوچھا۔

لاجونتی نے ریکھا کی پیشانی چومی اور بولی "میں کل تمہارے ساتھ چلوں گی۔ مجھے اپنے اسکول میں نوکری دلا دو گی نا؟"

ریکھا نے کوئی جواب نہ دیا چپ چاپ ماں کے سینے سے لگی رہی۔ بسکٹوں اور مٹھائیوں کے ادھ کھلے پیکٹ فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ باہر دھوپ نکل آنے کی وجہ سے کمرے میں کچھ اجالا ہو گیا تھا۔

شام کو روی صرف نو پیسے کما کر لا سکا۔ فیس کا انتظام نہ ہوا۔

دوسرے دن لاجونتی ریکھا کے ساتھ اسکول جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ روی کو پھر اسی بک اسٹال پر جانا پڑا۔ تینوں دروازے سے نکلے تو کندن لال اپنی لدی پھندی سائیکل سمیت کھڑا تھا۔ تینوں اندر لوٹ آئے۔ کندن لال نے سائیکل ڈیوڑھی میں کھڑی کر دی۔ اور بھرے ہوئے تھیلے اتار کر اندر لے آیا۔

"یہ تھوڑے سے چاول ہیں۔"

"ہم کیا کریں گے؟ بچوں کو تو پسند بھی نہیں۔" لاجونتی نے نامنظوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"پسند کیوں نہیں؟ بہت اچھے ہیں۔ میرے ایک دوست ڈیرہ دون سے تحفہ لائے ہیں۔"

لاجونتی کو گہری سوچ میں دیکھ کر وہ پھر کہنے لگے۔ "مجھے رکا کر دینے والا تو

کوئی ہے نہیں۔ تم پکاؤگی تو میں بھی چکھ لوں گا۔ کیوں روی مجھے اپنے ساتھ کھلا دو گے نا؟"

روی نے اس کے قریب جاتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا جو ٹھنڈے چولہے کے پاس سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی۔ کندن لال نے روی کو پیار کرتے ہوئے پوچھا "سویرے سویرے تم کہاں جا رہے تھے؟"

روی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک بار ماں کی طرف دیکھ کر سر جھکا لیا۔
"تمہارے تو اسکول جانے کا وقت آ گیا ہے۔ لاجونتی! کیا انھیں لے جا رہی تھیں؟"

ریکھا جو ابھی تک ماں کی کمر سے لگی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ یکایک تن کر کھڑی ہو گئی روتے روتے بولی "ممی آپ کو کچھ نہیں بتائیں گی . . . . بتاتی ہوں۔ ہمارے پاس فیس دینے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ روی نے کل سے اخبار بیچنے کی نوکری کر لی ہے اور ممی آج ــــــ"

"چل جھوٹی کہیں کی" لاجونتی نے اسے گھوم کر پکڑنا چاہا لیکن اسے اپنی پکڑ سے باہر پاکر منہ چھپا کر رونے لگی۔

"یہ کیا کر رہی لاجونتی! پاگل ہو گئی ہو کیا؟" لالہ کندن لال نے ریکھا کو گود میں بٹھا لیا۔

روی نے بہت سنجیدگی سے کہا "یہ سچ ہے۔ اب ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں کہ فیس دے سکیں۔ لیکن ہم ہمت نہ ہاریں گے۔ میں اخبار بیچ کر یہ خرچ ضرور پورا کر لوں گا۔ ممی بھی کہیں نوکری تلاش کرنے کی کوشش کریں گی۔"

"تم سب بے وقوف ہو۔ سب نالائق! یہ بات مجھ سے کل ہی کیوں نہ کہہ دی؟ چلو میرے ساتھ اٹھاؤ اپنی اپنی کتابیں" اس نے روی اور ریکھا کی کتابیں

خود ہی لے لیں۔ دونوں کو باہر لے آیا اور لاجونتی سے کہہ گیا۔

"میں شام کو آؤں گا۔ اور کھانا یہیں کھاؤں گا۔"

باہر نکل کر ریکھا کو آگے بٹھا لیا اور روی کو پیچھے کیریر پر۔

شام کو بچے اسکول سے لوٹے تو بہت خوش تھے۔ "ماں انکل کتنے اچھے ہیں!" روی نے اپنا اور ریکھا کا پلاسٹک کا نیا بیگ دکھاتے ہوئے کہا۔

ریکھا نے ماں کی گود میں گھستے ہوئے کہا: "ممی! انکل کا گھر کہاں ہے؟"

"ادھر عالم باغ میں۔"

"وہاں کس کے پاس رہتے ہیں؟"

"اکیلے ہی رہتے ہیں بے چارے۔"

"یہاں کیوں نہیں رہتے ہمارے ساتھ؟"

لاجونتی خاموش رہی۔ "بتاؤ نہ ممی! تم ان سے کہتی کیوں نہیں؟ یہاں ہمارے ساتھ رہا کریں۔"

"میں کہوں گا آج جب وہ ہمارے گھر آئیں گے۔ تو انھیں جانے نہیں دوں گا۔" روی نے چہک کر کہا۔

"چپ رہ۔" اس سے آگے لاجونتی کچھ نہ کہہ سکی۔

شام کو کندن لال کھانا کھانے آیا تو اپنے ساتھ راشن کا بہت سارا سامان بھی اٹھوا لایا جسے دیکھ کر لاجونتی گھبرا گئی۔ بڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ بولی: "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"کیا کر رہا ہوں؟" وہ ہنس دیا "ذرا دیکھو تو اپنی طرف۔ ان بچوں کی طرف کیا گت بنا رکھی ہے۔ کیا اسی کا نام ہمت ہارنا نہیں ہوتا؟ بس مہینے تین سو روپے پاتا ہوں۔ تمام ہوٹل والے لے لیتے ہیں اور پھر بھی بھوکا رہتا ہوں۔ تم

مجھے ایک وقت ہی کھانا پکا کر دے دیا کرنا۔ تمھیں تکلیف تو ضرور ہوگی لیکن میری صرف اتنی خواہش کو مان لو۔ میں کسی نہ کسی بہانے بچوں کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔ ان سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے، سکون ملتا ہے۔ اور پھر یہ ہونہار تو۔۔

ادھیڑ عمر کا گنجے بالوں والا کندن لال روتی اور ریکھا کو اپنی ٹانگوں سے چمٹائے بڑے گمبھیر لہجے میں اس سے التجا کر رہا تھا۔ لاجونتی دیوار سے لگی سن رہی تھی۔ اور اس کا دل ڈوب رہا تھا۔

کچھ دن اور گزر گئے۔ لاجونتی کندن کے لیے دونوں وقت کا کھانا پکاتی۔ بچے اس کے بہت قریب آ گئے تھے وہ سب اسے انکل کہہ کر پکارتے تھے۔ اس سے اپنی ضروریات کی چیزیں حاصل کرتے تو کندن لال بہت خوش ہوتا۔ لیکن لاجونتی کو بڑی شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ وہ بے بس تھی۔ کبھی کندن لال کی غیر موجودگی میں بچوں کو ڈانٹتی بھی تو بچے تنک کر جواب دیتے تھے۔

"کیوں نہ مانگیں؟ وہ ہمارے پاپا سے تو بہت اچھے ہیں۔"

ایک دن روتی اور ریکھا نے ضد پکڑ لی۔ "ہم آپ کو جانے نہیں دیں گے انکل!"

"آپ ہمارے گھر سویا کریں۔"

لاجونتی اور کندن لال دونوں نے سر جھکا لیے۔ بچے بار بار کہتے ہیں لیکن دونوں کے پاس سوائے خاموشی کے اور کوئی جواب نہ تھا۔

اس دن جب انکل انہیں کوئی جواب دیے بغیر واپس چلے گئے تو بہت اداس معلوم ہوتے تھے۔ بچوں کی ضد کا گہرا اثر پڑا۔ لاجونتی بھی اس سے متاثر ہوئی۔ وہ کندن لال کے دل کی کیفیت جان گئی تھی۔ لیکن وہ اس سے اس معاملے میں کوئی گفتگو کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جب وہ بغیر کچھ کہے چلا گیا تو لاجونتی کو جیسے ایک بہت بڑی مشکل سے چھٹکارا مل گیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد پھر وہ

دماغی الجھنوں میں پھنس گئی۔ اس کا دل چاہا کہ راتوں رات مکان بدل کر کسی دوسری جگہ چلی جائے۔

بچے سو گئے تھے۔ اس نے پیچ پیچ سامان بٹنا شروع کر دیا۔ اسے اب کندن لال کے سامنے آتے ایک خوف سا لگنے لگا تھا۔ جب وہ تان پارہ ہاؤس چھوڑ کر ناکہ ہنڈولہ کی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں آئی تھی۔ تو اس نے اپنا سامان فروخت کر دیا تھا۔ یہاں اس وقت ایک ٹرنک ایک۔ بستر ایک کھٹیا اور کچھ برتنوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ لیکن جب سے کندن کی آمدورفت ہوئی تھی گھر کے سامان میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ دو اور مضبوط چارپائیاں آگئی تھیں۔ بچوں کے پڑھنے کے لیے ایک بڑا کیروسین لیمپ بھی آگیا تھا۔ اس طرح گھر کی کئی دوسری چیزوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا۔ جیسے کندن لال کا اس گھر پر دھیرے دھیرے پورا اختیار ہوتا جا رہا ہے۔ جیسے وہ خود بھی اس گھر کا فرد ہو! ایک دماغی کشمکش اور بڑی اُداسی کے بعد لاجونتی اپنے دل سے کندن لال کے لیے عرصے سے موجود عزت کو ختم نہ کر سکی۔ اس کا وجود اس گھر میں بالکل باپ جیسا تھا۔ اس میں کندن لال کا کوئی قصور نہیں تھا۔ بچے باپ کی شفقت پانے کے لیے بہت بے چین و بے قرار تھے۔ وہ ناسمجھ تھے۔ بے سہارا تھے۔ مجبور تھے۔ سہارا چاہتے تھے۔ باپ کی شفقت اور پیار کے بھوکے تھے۔ وہ انھیں کیوں کر روکتی ؟۔ ایک چھوٹی سی بات سمجھانے کے لیے دنیا بھر کی باتیں سمجھانا پڑتیں۔ جنھیں وہ زبان پر بھی نہیں لانا چاہتی تھی۔ وہ پورا سامان نہ سمیٹ سکی۔ روتے روتے، سوچتے سوچتے۔ کچھ بندھے اور کچھ کھلے سامان کو چھوڑ کر بچوں کے ساتھ جا لیٹی۔

دو دن تک کندن لال بھی نہ آیا۔ اس کے نہ آنے سے بچے بہت پریشان ہوئے۔ بار بار ماں سے نہ آنے کا سبب دریافت کرتے۔ لاجونتی کے پاس

کوئی جواب نہ تھا۔ وہ خود پریشان تھی۔ ایسا لگتا تھا۔ جیسے کندن لال نے نہ آکر اس کی دماغی الجھن اور بھی بڑھا دی ہو۔ کہیں وہ بیمار نہ پڑ گیا ہو؟ کون آکر بتاتا؟ اُس کا گھر بھی نہیں جانتی تھی۔ بچوں کی باتوں سے اس نے کوئی غلط مطلب نہ نکالا ہو؟ اسے اپنے متعلق کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو گئی ہو؟ لاجونتی نے اپنے آپ کو بہت کمزور محسوس کیا۔ اُسے ایسی گھٹن محسوس ہوئی جس کا تجزیہ وہ ایک بار پہلے بھی کر چکی تھی۔

اس دن دوپہر کو جب بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔ ڈیوڑھی میں کندن لال کے سائیکل رکھنے اور کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ وہ لپک کر سامنے جا پہنچی۔ وہ سچ مچ کندن لال ہی تھا۔ چہرے پر ایک گمبھیر مسکراہٹ لیے۔ بالکل ایسے جیسے ہوا کے جھونکے بہار کی آمد کی خبر دیتے ہیں۔ لیکن لاجونتی کا دل دھڑکنے لگا۔

"بچے ابھی تک لوٹے نہیں؟" اس نے اِدھر ادھر دیکھ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"لاجونتی خاموش کھڑی رہی۔ کہنا چاہتی تھی" کیوں بنتے ہو۔ تم نے جان بوجھ کر آنے کے لیے ایسا ہی وقت چنا ہے۔ پھر وہ پلٹ کر انگیٹھی کے پاس جا بیٹھی اور راکھ کریدنے لگی۔ کندن نے کہا "میں کچھ کھاؤں گا نہیں۔"

"دو دن آئے نہیں۔" لاجونتی بڑی کوشش سے بولی۔ اس نے کندن کی طرف دیکھا تو اسے ایک دماغی کشمکش میں مبتلا پایا۔ اچانک وہ بولا "لاجونتی میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

لاجونتی نے سر جھکا لیا۔ اس کا دل چاہا دھرتی پھٹ جائے اور وہ یونہی بیٹھے بیٹھے غائب ہو جائے۔

اس نے پھر کہا "کیا تم نے سنا تھا۔ اس دن بچے کیا کہہ رہے تھے؟"

لاجونتی کے آنسو نکل پڑے اس نے گھٹنوں میں سر دے لیا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا ؟"

"چپ ہو جاؤ بھگوان کے لیے ؟" وہ سسکتے ہوئے بولی "میں شادی شدہ ہوں۔ میرا پتی" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

"ہوں! وہ کیسا پتی ہے! جانے کہاں ہے۔ جس نے لوٹ کر خبر نہ لی! اس نے دوسری عورت بھی تو رکھ لی ہے"!

لاجونتی نے روتے روتے سر ہلا دیا جیسے کہہ رہی ہو "نہیں۔ نہیں۔ نہیں!"

"لیکن سنو تو وہ تمہیں چھوڑ چکا۔ تم اسے عدالت کے ذریعہ نوٹس دے سکتی ہو۔ اگر وہی رکاوٹ ہے تو اسے دور کر دیا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں تم اور بچے ۔۔۔! میں بھی تو اپنا گھر بنانا چاہتا ہوں"

لاجونتی اٹھ کر کمرے سے باہر چلی آئی۔ آنچل میں منہ ڈال کر روتے ہوئے بولی۔

"آپ۔ آپ جائیے۔ میں یہ سب کچھ سننے کے تیار نہیں!"

کندن لال اٹھ کھڑا ہوا۔ سر جھکا کر شرمندہ سا اداس سا، لڑکھڑاتا ہوا جاتے جاتے جیب میں سے کچھ روپے نکالے اور دہلیز پر رکھ کر بولا "آج تنخواہ ملی ہے یہ رکھ لو"

"مجھے نہیں چاہیے"

"بچوں کے لیے ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ پھر کبھی نہیں آؤں گا۔ میں معافی چاہتا ہوں"

وہ اپنی سائیکل لے کر چلا گیا۔ لاجونتی دیر تک روتی رہی۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ایک پرائے مرد سے مدد لینے کا انجام یہی ہو سکتا ہے! ایک۔

بے سہارا عورت کی مدد کرکے ایسی بات کتنی آسانی سے کہی جاسکتی ہے۔ لیکن وہ کب تک یوں بے سہارا رہے گی؟

شام کا کھانا پکاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ اس کا شوہر واقعی اسے چھوڑ چکا تھا۔ کسی دوسری عورت کے ساتھ عیش کی زندگی گزار رہا تھا۔ لاجونتی کو اپنے اندر ایک بغاوت سر اٹھاتے ہوئے محسوس ہوئی۔ نفسیاتی طور پر اس بغاوت کے بیج تب ہی دل کی گہرائیوں میں پڑ گئے تھے جب اس نے پہلے پہل اپنے شوہر کے متعلق دوسری عورت کے ساتھ عیش کرنے کی خبر سنی تھی۔ لیکن اس بغاوت کو اس نے آج تک دبائے رکھا تھا۔ حالاں کہ یہ اس نے نا سمجھی کی حالت میں کیا تھا لیکن پھر بھی وہ اس بغاوت کی اہمیت سے کبھی لاپرواہ نہ رہی تھی۔ اس کا خاص سبب یہ تھا کہ آج تک اس کے نزدیک، کوئی ایسا مرد نہیں آیا تھا جو اس کے دل کی بغاوت کو اور بھڑکا سکتا۔ بچوں کی پرورش کے خیال نے اسے اور بھی باتوں سے الگ کر دیا تھا اور یہ ممکن تھا کہ وہ اسی طرح اپنے دل کی اس بغاوت کو بھولی رہتی۔ اسے کبھی احساس بھی نہ ہوتا کہ سماج نے اس کے ساتھ ایک بہت بڑی ناانصافی کی ہے۔ اور جس دور میں یہ سب کچھ ہوا اس دور میں سماج کو عدالت میں گھسیٹے جانے کی آسانیاں تھیں۔ ادھیڑ عمر کے تندرست سنجیدہ اور محبت کرنے والے کندن لال میں کیا برائی تھی؟ اس نے لاجونتی کے دل میں داخل ہونے کے لیے دور کا راستہ اپنایا تھا۔ پہلے وہ بچوں پر مہربان ہوا۔ بچوں کے احساس پر باپ کی سی محبت کا سایہ ڈالنے کے بعد لاجونتی کو انہی کے سبب بار بار ایک باپ کی ضرورت کا احساس دلایا تھا۔ باپ کا پیار کسی بھی انسان کے برتاؤ میں ہو سکتا ہے۔ کندن لال نے جو اچانک اپنی نئی تصویر لاجونتی کے سامنے رکھ دی تھی۔ وہ دل شکن زیادہ تھی اور پرکشش کم۔ اگر وہ سیدھے

راستے سے لاجونتی کے نزدیک اپنا سوچا پیار اور اپنی کشش لے کر آیا ہوتا تو آج لاجونتی کے دل کی حالت بالکل ہی مختلف ہوتی۔ پھر بھی اس کی باتوں نے لاجونتی کو متاثر کیے بنا نہ چھوڑا تھا۔

کندن لال نے آنا بند کر دیا۔ لاجونتی اسی کے متعلق سوچا کرتی تھی۔ ڈیوڑھی میں سائیکل رکھنے کی آواز سننے کی منتظر رہتی۔ ہر لمحے اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اسے ایک دن خود کندن لال کے گھر جانا پڑے گا۔

بچوں سے زیادہ خود اسے اس کی ضرورت تھی۔

بچے اس واقعہ سے بہت پریشان تھے۔ وہ اس کے لیے ماں کو ذمہ دار ٹھہراتے کبھی کبھی سچ مچ لاجونتی میں بچوں سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہ رہتی۔ بچے جب اداس ہو کر اس کی طرف گھورتے تھے تو اس کا جی چاہتا کہیں چھپ جائے۔ بھاگ جائے۔

ایک دن روی اور ریکھا گھر لوٹے تو ماں کو پکارا "ممی دیکھو ہمارے ساتھ کون ہے؟"

کون ہے؟" اس نے چونک کر دیکھا۔

دونوں نے کندن لال کے بازو تھام رکھے تھے۔ کندن لال مسکرا رہا تھا اس کی آنکھوں میں محبت تھی، بینتالیس سال کا سنجیدہ انسان بیس سال کا شرمیلا نوجوان معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے زبردستی پکڑ کر اس کی محبوبہ کے سامنے کھڑا کر دیا گیا ہو۔

"ممی اب انھیں جانے نہ دینا"

"میں انھیں باندھ کر تھوڑی رکھ سکتی ہوں" لاجونتی نے مسکرا کر کہا۔ اس نے یہ کہتے ہوئے ذرا بھی گھبراہٹ نہ محسوس کی۔ کندن لال کے چہرے پر پہلے

کی کشمکش کی جھلک بھی نہ تھی۔ برخلاف اس کے ایک جوش ٹپک رہا تھا۔

"سنا تم نے؟ تمھاری ممی کیا کہہ رہی ہے؟ اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ میں نہ جاؤں تو میں آج سے یہیں رہوں گا۔ تمھارے پاس۔ پھر کبھی نہیں جاؤں گا۔"

وہ شام بے حساب خوشیاں لائی تھی۔ لاجونتی نے کندن لال سے عدالتی کارروائی کے متعلق پوچھ گچھ کی۔ وہ تمام حالات سے گزرنے کے لیے تیار تھی۔ اس نے نئے مستقبل کی ایک حسین تصویر بنا ڈالی۔

اسی شام کندن لال اپنے گھر سے اپنی پہلی بیوی کے زیور اٹھا لایا اور لاجونتی کو سونپ دیئے۔

وہ کمرے کے درمیان بچھی ہوئی چادر پر کھانے کے لیے بیٹھے تھے: تنگ و تاریک کمرہ ان کی اور بچوں کی باتوں اور قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

اسی وقت ایک شخص دروازے پر نا واقفوں کی طرح ظاہر ہوا۔ اسے دیکھ کر گونجتے ہوئے قہقہے بجلی کے قمقموں کی طرح بھک سے بجھ گئے۔ وہ لاجونتی کا شوہر تھا۔

لاجونتی اور کندن لال اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بچوں نے اپنے پاپا کو پہچان کر بھی تالی نہ بجائی۔ کوئی خوشی ظاہر نہ کی بلکہ وہ اس خوشی کی محفل کے اچانک ختم ہو جانے سے ناراض تھے۔

لاجونتی نے اپنے شوہر کندن لال سے تعارف کرانا ضروری نہ سمجھا کیوں کہ دونوں ایک دوسرے سے واقف تھے۔ اس کا شوہر بغیر کچھ کہے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کندن لال نے اس کی خیریت پوچھی مگر اس کے نامناسب برتاؤ سے بد دل ہو کر باہر چلا گیا۔ لاجونتی اسے چھوڑنے کے لیے ڈیوڑھی تک گئی۔ اس نے جانے سے پہلے کہا: "دیکھو لاجونتی! تمھارا پتی پھر لوٹ آیا ہے۔ اور میں خوش

ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمھیں اچھی طرح سوچنے کا ایک اور موقع ملا ہے۔ میں نہیں جانتا تمھارا فیصلہ کیا ہوگا! تم کس کے ساتھ رہنا پسند کرو گی۔ اگر تم اس کے ساتھ رہنا چاہو گی تو مجھے کوئی دکھ نہ ہوگا۔ میں پھر اپنی دنیا میں لوٹ جاؤں گا میری دنیا تم جانتی ہو دن بھر سائیکل پر فائلیں رکھ کر مارے مارے پھرنا۔ اتنا ضرور کہوں گا۔ میں تمھیں اور تمھارے بچوں کو تمھارے پتی سے زیادہ چاہتا ہوں۔ جاؤ اب اندر جاؤ! اس کے ساتھ بات چیت کرو۔ اس کے خیالات معلوم کرنے کی کوشش کرو۔ میں کل صبح آؤں گا۔ تمھارا فیصلہ سننے۔"

وہ سائیکل پر بیٹھ سر کو آگے جھکائے سڑک پر گہری شام کی بھیڑ میں کھو گیا۔ لاجونتی پلٹی تو بچوں کو پیچھے کھڑا پایا۔

انھوں نے اپنے باپ کے پاس بیٹھنا پسند نہیں کیا تھا۔

اس کا شوہر چارپائی کے ایک کونے پر ناواقفوں کی طرح بیٹھا تھا۔ دونوں کچھ لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ گھورتے رہے۔ کچھ دیر بعد اس کے شوہر نے کہا۔

"مجھے بہت افسوس ہے۔ میں بے کار ہی چلا آیا۔ مجھے معلوم ہوتا تو کبھی نہ آتا۔"

لاجونتی کے اندر جیسے لاوا پھوٹ پڑا۔ چلّا کر بولی "تمھیں آنے کے لیے کس نے کہا تھا؟ اس عورت نے تمھیں میرے پاس آنے کیسے دیا؟"

"میں جانتا ہوں۔ یہ تم کیوں کہہ رہی ہو! کندن لال تمھارے پاس روز آتا ہے۔ یہ بھی میں سن چکا ہوں۔"

"پھر؟ میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ تم کیا چاہتے ہو؟ میرا فیصلہ غلط نہیں ہے۔ بچوں کو کسی کا تو سہارا چاہیے۔"

"میں یہ کب کہتا ہوں؟" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ ایک میلی بوسیدہ سی پتلون میں ہاتھ ڈالے۔ اس کے کوٹ کی پشت پر پانی کا بہت بڑا داغ بنا ہوا تھا۔ بچے کمرے کے اندر نہیں آئے تھے۔ باہر جنگلے سے لگے آنگن میں کھڑے ہوئے تھے۔

اس نے لاجونتی کے قریب جا کر کہا: "میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں۔ اگر تمہارا یہ فیصلہ آخری نہیں ہے اور مجھے اپنے دل سے یکمل طور پر نکال نہیں چکی ہو۔ تو میں پھر اسی گھر میں رہوں گا۔ میں اپنی غلطیوں پر بہت شرمندہ ہوں۔"

یہ سن کر لاجونتی پر خاموشی چھا گئی۔ اسے یقین نہ آیا کہ یہ سب کچھ اس کے شوہر نے کہا ہے جس نے اسے کئی بار چھوڑا ہے اور رُلایا ہے۔ اور اب دو سال کے طویل وقفے کے بعد پھر اپنی محبت کا یقین دلا رہا ہے۔ اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ جن میں پچھتاوا تھا۔ محبت تھی وہ ہی محبت جس پر دو سال تک اپنے پاس رکھنے کے بعد بھی ایک غیر عورت اختیار نہ پا سکی تھی۔ اس سے ظاہر تھا وہ محبت صرف اسی کی تھی وہ اس کی پھیلی ہوئی باہوں میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح گر پڑی۔ اس کے سینے کے ساتھ لگ گئی اور سسکنے لگی۔ اس کے شوہر نے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ اس کی آنکھوں، اس کے ہونٹوں، اس کے منہ پہ ہر جگہ بوسے لیے۔ وہ سسکیوں کے درمیان سنتی رہی: "لاج! میں کتنا بُرا ہوں۔ بالکل بے وقوف۔ میں تم جیسی دیوی کے قابل کبھی نہیں تھا۔ کبھی نہیں۔"

لاجونتی کو اپنا کھویا ہوا پیار واپس مل گیا۔ اس کی ہیجانی زندگی میں سکون لوٹ آیا ــــــ شانتی چھا گئی بے حساب سکون۔ اس کے چاروں طرف پھول کھل اٹھے۔ اپنی ساری خوشبوؤں سمیت

وہ اپنے خیالوں اپنے فیصلوں اپنے جلد بازی پر دل ہی دل میں پچھتائی۔

اسے کندن لال سے اتنی جلد گہنے نہیں لینے چاہیے تھے۔ کل صبح آئیں گے تو لوٹا دے گی۔

جب رات کو شوہر کے سینے پر سر رکھ کر سوئی تو اس نے رو رو کر اس سے معافی مانگی۔ اس نے عہد کیا وہ غلطی کا ازالہ کرے گی۔ ہر منگل کو برت رکھے گی۔ روزانہ مندر میں جاکر بھگوان کے آگے لیٹ کر ناک رگڑے گی۔ اس نے اپنے شوہر سے درخواست کی کہ وہ تمام مقدس مقامات کی یاترا کرائے۔ اس کے شوہر نے اس کی خواہش پوری کرنے کا وعدہ کیا۔ وہ خود بھی اپنی غلطیوں کا کفارہ چاہتا تھا۔

صبح وہ بہت دیر سے اٹھی۔ رات اسے بڑی میٹھی نیند آئی تھی۔ ایک عرصے بعد وہ اس طرح سو سکی تھی۔ آنکھ کھلی تو کمرے میں روشنی۔ وہ بہت گھبرائی شوہر کے ساتھ لیٹا دیکھ کر بچے کیا سوچیں گے؟ کہیں بچے سچ مچ نہ جاگ گئے ہوں۔ لیکن بچے سو رہے تھے۔ لیکن اس کا شوہر بستر پر نہ تھا۔ جانے وہ کب چلا گیا تھا۔ کہاں تھا؟ وہ اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔ وہ آنگن میں بھی نہ تھا۔ سامنے ڈیوڑھی میں دکھائی دینے والی سڑک، اور اس کے پار کمیٹی نل پر بھی نہ تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا چارپائی کے نیچے دیوار کے ساتھ لگا ہوا ٹرنک کھلا پڑا تھا۔ کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ کندن لال کے دیے ہوئے گہنوں کا بکس خالی پڑا تھا۔ اسی وقت اسے ایسا لگا جیسے ڈیوڑھی میں سائیکل رکھنے کی آواز سنائی دی ہو!

تیری گلی میں

جس وقت وہ کچہری سے نکلا اس کی جیب میں چھ آنے بچے ہوئے تھے۔ صرف چھ آنے۔ اس نے اپنے وکیل کا انتظار بھی نہ کیا اور چل دیا۔ اسے سخت بھوک ستا رہی تھی۔ بھوک اور تھکن دونوں اس کے چہرے سے عیاں تھیں۔ اگر وہ کسی ڈھابے پر سے کھانا کھا لیتا تو پھر اسے گھر تک پیدل چلنا پڑتا۔ گھر چار میل دور تھا۔ وہاں تک بسیں، تانگے رکشے سبھی کچھ جاتے تھے۔ لیکن اس کے پاس صرف چھ آنے تھے اور وہ صبح سے بھوکا تھا۔

صبح گھر سے چلتے وقت اس نے چائے کا ایک کپ لیا تھا۔ دو باسی چپاتیاں کھائی تھیں۔ اس کی ماں نے روٹیوں پر تھوڑا گھی مل کر اوپر نمک اور لال مرچیں چھڑک دی تھیں۔ پچھلے دو سال سے وہ کچہری کے اسی راستے پر جوتیاں گھستا پھرتا تھا۔ ہر بار ایک نئی ہی تاریخ پڑ جاتی تھی اور ہر تاریخ اس کے چہرے پر مایوسی اور بیزاری کی پہلی چھاپ کو اور گہرا کر دیتی تھی۔ آج تو عدالت نے اس کا مقدمہ ہی

خارج کر دیا تھا۔ وہ اور اس کا وکیل یہ ثابت کرنے میں ناکام رہے تھے کہ شیلا اور وہ الگ ہونے سے پہلے آخری بار اکٹھے کہاں رہے تھے۔

اس نے سڑک پر چلتے چلتے ایک خوب صورت لڑکی کی طرف تاکا جو کتابیں اٹھائے چلی جا رہی تھی۔ وہ اپنے روکھے بال کھجانے لگا۔ اس کی قمیص کا کالر اندر گھسا ہوا تھا لیکن وہ اس سے بے خبر تھا۔ لڑکی کو دیکھ کر اسے شیلا یاد آ گئی یعنی شیلا کے ساتھ جب اس کی شادی ہوئی تھی تو وہ بھی اسی طرح خوب صورت تھی۔ ایسے ہی دل کش اس کے بال تھے اور قد اور لمبی گردن اور ــــــ

وہ سڑک کے پار فٹ پاتھ پر سے اس لڑکی کی طرف دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں بے شمار ناہموار اندھیری گلیاں اور کوٹھوں کی گھسی پٹی، پان کی پیکوں سے لتھڑی ہوئی داغ داغ سیڑھیاں بھی گھس آئیں۔ اسی وقت اسے سگریٹ پینے کی خواہش بھی ہوئی۔ اس نے اپنی جیب میں پڑے ہوئے چھ آنے بھی ٹٹولے۔ اچانک ہی ایک رکشا جاتے جاتے اس کے پاس رک گئی۔ اس میں سے اس کا وکیل جھانکنے لگا۔

"ارے! یہ تم جا رہے ہو، تمھیں تو میں کچہری میں ڈھونڈتا رہا۔"

وکیل کے لہجے میں بناوٹی حیرت تھی۔ اس سے اپنے وکیل کی طرف نہ دیکھا گیا۔ نیچے پاجامے کو اوپر کھینچا۔ اور اپنے مقدمے کی فائلوں سے بھرے ہوئے تھیلے کو سینے سے لگا کر پوچھا ــــ "اب کیا حکم ہے وکیل صاحب!"

"کچھ نہیں تمھیں دیکھ کر ہی رکشا رکوالی۔" پھر سر باہر نکال کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا "یہاں پان وان کی دکان قریب نہیں ہے؟ وہ ہے تو! سورج ذرا لپک کر چار پان بنوا کر لاؤ۔ پیلی پتی کی تمباکو الگ سے لے لینا۔"

سورج کی آنکھوں میں غصّے کی جھلک اور گہری ہو گئی۔ لیکن وہ سڑک پار

کر کے پان کی دکان پر چلا گیا۔ چار پان لاکر وکیل کو دے دیئے۔ وکیل منہ میں دائیں بائیں پان بھر کر "اچھا بھئی چلیں" کہتا ہوا رکشا آگے بڑھالے گیا۔ چاہتا تو امین آباد کے چوراہے تک اسے اپنے ساتھ بٹھا کر لے جا سکتا تھا لیکن اس نے سورج کو یہ لفٹ نہ دی۔ سورج دل ہی دل میں کڑھتا ہوا پھر چل پڑا۔ وکیل کے علاوہ وہ جو اس کا منہ نہیں جھنا سکا تھا، وہ شیلا کے ماں باپ پر بھی دانت پیسنے لگا۔ تھیلے کو بار بار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں بدلا۔ کبھی کبھی اس کا ایک ہاتھ جیب کے اندر بھی چلا جاتا جس میں اب چار آنے بچے تھے۔ وہ کئی موٹلوں اور ڈھابوں کے سامنے سے گزرا۔ گرد اڑاتی ہوئی کئی بسیں پاس سے گزر گئیں۔ تانگے اور رکشے والے پوچھ پوچھ کر ہار گئے۔ وہ پیدل چلتا رہا۔

گھر پہنچا تو بوڑھی کبڑی ماں کو دروازے پر انتظار کرتے پایا۔ لیکن وہ اس کے ساتھ کوئی بات کیے بغیر ہی اندر چلا گیا۔ اندر جا کر ایک چارپائی پر پڑ رہا۔ بازو سے منہ چھپا لیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ کتنی دیر تک اسی حالت میں پڑا رہا۔ اس کی کبڑی ماں دھیرے دھیرے ہمتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ لیسے سویا ہوا پا کر اس سے کچھ کہا نہیں۔ اسے چھوا بھی نہیں پیار سے سر یا بدن پر ہاتھ پھیرنا چاہتی تھی لیکن اسے گھورتی رہی۔ پھر جھکی جھکی کمر کے ساتھ پرچھائیں کی طرح چلتی ہوئی کمرے کے کونے میں جا بیٹھی۔ آگ پر رکھی ہوئی پتیل کی پتیلی میں چمچ ہلانے لگی۔ چمچ اور پتیلی کے ٹکرانے کی آواز سن کر سورج نے آنکھیں کھول دیں۔ لیٹے لیٹے ہی غصے سے پوچھا۔ "کھانے کے لیے کچھ زہر وہر تیار ہے کہ نہیں؟"

یہ سن کر بڑھیا کے چہرے کی جھریاں اور بھی گہری ہو گئیں۔ اس نے بیٹے کی طرف دیکھنے کی بجائے پتیلی کے نیچے سُرخ چمکتے ہوئے کوئلوں کو گھورا اور پھر ایک تھالی اٹھا کر آٹا گوندھنے لگی۔

"ابھی تم آٹا گوندھوگی؟ تب تک تو شاید میری جان ہی نکل جائے!"

اس کی ماں نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ ایک اور برتن میں صبح کا بچا ہوا خمیر آٹا اٹھا کر اسے دونوں ہاتھوں میں سانتے لگی۔

"تمھاری بلا سے میں مر جاؤں! مر جاؤں نا؟" وہ معمولی سامان سے بھرے ہوئے چھوٹے سے کمرے میں چارپائی پر بڑبڑاتا بولتا رہا۔ ماں سے نہ رہا گیا۔ تو پوپلے منھ میں بڑبڑانے لگی —— "تو مر جائے گا تو میری چتا کو آگ کون دے گا، بیٹا!" یہ کہتے کہتے اس کے آنسو بھی چھلک پڑے جو نیچے گالوں پر پھیلے ہوئے جھریوں کے جال میں کھو گئے۔

اس نے ماں کے رونے کی پروانہ کی۔ چھت کو گھورتا ہوا بولا۔ "تو پھر تم ہی مر جاؤ۔ مرتی کیوں نہیں تم؟"

"کیسے مر جاؤں بیٹے! میرے اپنے اختیار میں تھوڑے ہی ہے! بیمار پڑتی ہوں پھر بچ جاتی ہوں۔ یہ میری بدقسمتی ہے۔ تو خود ہی میرا گلا گھونٹ دے۔"

"تمھارا گلا میں گھونٹ دوں؟ ہیں!" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ لیکن اس کی آواز میں وہی بیزاری تھی۔

"ہاں تو ہی گھونٹ دے نا!" لیکن وہ ابھی اس بات کے لیے تیار نظر نہیں آتی تھی۔ سر جھکا کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے جلدی جلدی کھانا بناتی رہی۔

اسی وقت مکان کے دوسرے حصّے میں رہنے والی صاف ستھرے کپڑے پہنے ادھیڑ عمر پڑوسن آگئی۔ یہ سارا مکان کچھ ہی مہینے پہلے ان سے اسی نے خریدا تھا ان کے پاس صرف ایک ہی کمرہ رہنے دیا تھا۔ اس کمرے کا وہ اسے تیس روپے کرایہ دیتے تھے۔

اونچی اور ہمدردی سے خالی آواز میں پوچھا: "کیا ہوا آج کچہری میں؟ کوئی

اور تاریخ تو نہیں پڑی ہے؟"

کسی نے اسے جواب نہ دیا۔ کبڑی ماں نے تھالی میں کھانا پروس کر اس کی چارپائی پر جاکر رکھ دیا۔ اس نے ہاتھ دھوئے بنا ہی جلد جلد روٹی کے کئی ٹکڑے کرکے ترکاری میں ڈال دیے۔ ترکاری میں انگلیاں ڈبوتے ہی ہاتھ باہر نکال لیا۔

"بتایا نہیں ترکاری گرم ہے! ہاتھ جل گیا۔!"

بڑی بے بسی سے اس کی طرف بڑھیا نے تاکا۔ بول نہیں سکی کچھ بھی پڑوسن نے کھڑے کھڑے پھر پوچھا: "لڑکی پیش ہوئی تھی۔؟"

"وہ کیوں پیش ہونے لگی۔" اس کی ماں نے ایسے اعتماد کے ساتھ کہا۔ جیسے جانتی ہو لڑکی پیش نہیں ہوئی تھی۔ "اس کے تو نانا، چاچا سبھی مدد کر رہے ہیں۔ دو سو خود بھی تنخواہ پاتی ہے۔ اسے کیا پڑی ہے کچہری میں پیش ہو! فیس دے کر وکیل کو بھیج دیتی ہے۔ ابھی تک تو ہم ہی مر رہے ہیں۔ دو سال سے کچہریاں جا جا کر۔!"

"اپنی بکواس بند رکھو۔" منھ میں لقمہ ڈالتے ڈالتے وہ چیخ پڑا۔ چبائے ہوئے لقمے کے کئی ذرّے اِدھر اُدھر اڑ کر نکل گئے۔ "آج میرا مقدمہ خارج ہوگیا ہے۔ دو سال کی محنت پر پانی پھر گیا ہے سُنا تم نے؟"

یہ سنتے ہی اس کی ماں کے ہاتھ سے آٹے کا پیڑا گر گیا۔ پڑوسن بھی ہکّا بکّا رہ گئی۔ سورج نے ترکاری سے تر بہ تر انگلی ماں کی طرف اٹھا کر کہا — "یہ سب تمھاری وجہ سے ہے۔ صرف تمھاری وجہ سے۔ تم ماں تھوڑی ہو! تم میری ماں ہوتیں تو میں آج اس مصیبت میں پھنسا ہوا نہ ہوتا!"

وہ دونوں ہاتھ منھ پر رکھ کر بلک بلک کر رو بھی پڑا۔

کچھ لمحوں تک بالکل سناٹا رہا۔ پھر اس کی ماں پڑوسن سے کہنے لگی "یہ تو سارا قصور مجھی پر ڈالتا ہے۔ اسی کی خاطر تو جی رہی ہوں۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کا گھر کسی طرح بس جائے تو میں بھی اپنی راہ لوں۔ جب اس کا باپ گزرا تھا تو یہ دو سال کا تھا صرف دو ہی سال کا۔ کیا یہی سننے کے لیے میں نے ساری زندگی کا رنڈاپا کاٹا ہے کہ میں اس کی ماں نہیں ہوں۔!"

پڑوسن ایک کاٹھ کی چوکی گھسیٹ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ بڑھیا رُو رُو کر اسے بتانے لگی "شیلا کو گھر سے میں نے نہیں نکال دیا تھا وہ جنم جلی آئی ہی اسی لیے تھی کہ اس کا گھر اجاڑ کر چل دے۔ تم وشواس کرو بہن۔ میں نے اس سے کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ اسے خود ہی اس گھر میں میرا رہنا اچھا نہ لگا۔ پہلے ہی دن مجھے دیکھ کر اس نے نفرت سے منھ پھیر لیا تھا۔ میں نے اسے رسوئی میں لے جانا چاہا کہ پہلے دن بہو کا رسوئی میں قدم رکھنا بہت شبھ مانا گیا ہے۔ لیکن اس نے وہاں جانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ غصے میں آ کر میں نے اتنی شکایت ضرور کی تھی، جھوٹ کیوں بولوں! بھگوان بھی دیکھ رہا ہے کہ تجھے ماں باپ نے بڑوں کا ادب کرنا بھی نہیں سکھا کر بھیجا؟ بس یہی کچھ اس سے کہا تھا۔ اتنی سی بات پر اس نے ایسا ہنگامہ کیا، ایسا ہنگامہ کہ بھگوان بچائے۔ اس کے ماں باپ یہ سنتے ہی اپنی لڑکی کو اپنے گھر لے گئے۔ انھوں نے بھی مجھی کو قصوروار ٹھہرایا۔ اپنی بیٹی سے کچھ بھی نہ کہا۔ تم ہی بتاؤ بہن، جب ماں باپ ہی ایسا کریں تو ان کی اولاد کا کیا حال ہوگا۔ اس پر بھی میں نے ہار مانی۔ اس کے گھر جا کر معافی مانگی۔ اپنے کتنے رشتے داروں کو بھی بھیجا۔ سب نے ان سے کہا اب ضد چھوڑ دو بھلے لوگو لڑکے کا گھر بسنے دو۔ مگر وہ کسی کی سننے والے تھوڑے ہی تھے۔ ہمیشہ الٹی سیدھی کہہ کر بات کو بڑھاتے گئے۔ تنگ آ کر میرے بیٹے کو کچہری کا منھ دیکھنا پڑا۔ بات

جب کچہری تک پہنچ گئی تو وہ اس بات پر کبھی اینٹھ گئے۔ کہ ہم نے ایسا کیوں کیا؟ اِس سے تو ان کے پریوار کی ناک کٹ گئی ہے۔ وہ بھی اس کا بدلہ لے کر رہیں گے تو بہن، وہ ابھی تک وہی بدلہ لے رہے ہیں۔ نہ تو لڑکی کو ہمارے گھر بھیجنے پر راضی ہوتے ہیں۔ نہ ہی چھوٹ چھٹکارا کرتے ہیں کہ کہیں بچارا دوسری ہی شادی کر لے!"

"نہیں بھئی سورج، اس میں تو تیری ماں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ تو بیکار میں بوڑھی ماں کو پریشان مت کیا کر!" پڑوسن اسے سمجھانے لگی۔ لیکن وہ کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا۔

"اس کی باتوں میں آدھے سے زیادہ جھوٹ ہے۔ اصل جھگڑا جہیز کا تھا—— کم جہیز لے آنے پر ہی اسے بہو پسند نہیں آئی تھی۔ اسی لیے اس کے مزاج میں سے سو سو کیڑے نکالے تھے۔"

"کم جہیز لانے کا گلا تو تو خود بھی اُس کے سامنے کیا کرتا تھا۔ صرف مجھی کو کیوں دوش دینا ہے؟" اس کی ماں زور زور سے رونے لگی۔

"جو کچھ تم مجھ کو پڑھا دیتی تھیں۔ وہی میں بھی بک دیتا تھا۔ کیا کرتا؟ اس وقت عقل کا کچّا تھا ماں!"

وہ ہاتھ دھونے کے لیے باہر نل پر چلا گیا۔ وہیں سے گلی میں نکل گیا۔ شام کو وہ ایک دکان پر "اکاؤنٹنٹ" کا کام کیا کرتا تھا۔ صرف دو گھنٹے روزانہ بیس روپے مہینے کے مل جاتے تھے۔ مکان بک کر مقدمے کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔ مقدمے ہی کے لیے اپنے محکمے سے قرض لیتا رہا تھا۔ تنخواہ کا بہت سا حصّہ قرض کی قسطوں میں کٹ جاتا تھا۔ کچہری جانے کے لیے آخری تاریخوں میں وہ جتنی چھٹیاں لیتا رہا تھا۔ وہ سب کی سب بغیر تنخواہ کے ہی مل سکی تھیں۔

سرکاری نوکری سے ملی ہوئی چھٹیوں کی ساری مراعات وہ ختم کر چکا تھا۔ آخری رعایت یہی رہ گئی تھی کہ دفتر میں بے دلی اور لاپروائی سے کام کرنے پر بھی اسے نوکری سے الگ نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کی پریشانیوں سے دفتر کے لوگ اچھی طرح واقف تھے۔ لیکن وہ اسے نیم پاگل اور بدحواس کہا کرتے تھے۔

دفتر میں اس کا سب سے بڑا بہی خواہ اس کا ہیڈ کلرک تھا۔ وہی اس کے لیے ایک ڈھال بنا رہتا تھا۔ اس کی وجہ سے اس سے باز پرس نہیں کی جاتی تھی۔ اس کی چار لڑکیاں تھیں، ایک کے اوپر ایک، سب ہی شادی کے قابل۔ وہ چاہتا تھا ایک لڑکی کی شادی سورج کے ساتھ ہی ہو جائے۔ سورج سے وہ اس بات کا وعدہ ایک سال پہلے لے چکا تھا۔ سورج کو طلاق کا مقدمہ لڑنے کے لیے اس نے بھی اپنے پراوڈنٹ فنڈ میں سے کچھ قرض لے لیا تھا۔ جتنا کچھ وہ خرچ کر چکا تھا اسے سورج کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی میں دی جانے والی ہی رقم سمجھتا تھا۔

ان دونوں کی ملاقات اسی دکان پر ہو گئی۔ جہاں سورج پارٹ ٹائم کام کرتا تھا۔ ہیڈ کلرک، اسے دیکھتے ہی بول اٹھا "میں تمھارے وکیل کے پاس سے آرہا ہوں ـــــ وہ کہتا ہے اب ہائی کورٹ میں اپیل ہونی چاہیے لیکن اس کے لیے تو بہت سارا روپیہ اور خرچ ہوگا۔ روپیہ خرچ کرتے کرتے تو تمھارا اور میرا کچومر نکل گیا ہے۔ لیکن میں نے ایک اور راہ نکالی ہے۔ تم جانتے ہو میں تو ہر دم تمھاری بھلائی کے لیے ہی کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہوں۔ میں تمھاری سسرال گیا تھا۔ انھیں اس بات کے لیے تیار کر لیا ہے کہ وہ تمھیں معاف کر دیں۔ تمھیں اس بات کی اجازت لکھ کر دے دیں کہ تم دوسری شادی کر سکو۔ لیکن اس کے لیے انھوں نے ایک شرط رکھ دی ہے۔ وہ چاہتے ہیں تم ان کے گھر آکر معافی مانگو"

یہ کہہ کر پچاس برس کا دُبلا پتلا ہیڈ کلرک مسکرانے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر، آنکھوں میں، اپنی ہی غرض کی چمک تھی۔ بڑی گہری چمک ــــ لیکن سورج جو اس کی بات سن کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ کانپتی ہوئی لیکن مضبوط آواز میں بول اٹھا۔ ”نہیں بڑے بابو۔ نہیں۔ میں اُن کے گھر تو کبھی نہیں جاؤں گا۔“

ہیڈ کلرک نے اُس کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ اسی طرح مسکراتے ہوئے بولا ”سورج، ایسا نہ کہو۔ زندگی میں کچھ فیصلے اپنے آپ کو مار کر بھی کرنے پڑتے ہیں۔ یہ سب ہمارے حالات ہی ہیں جو ہمیں کبھی کبھی اتنا ذلیل کر دیتے ہیں۔ میں تمھاری گھبراہٹ کو سمجھتا ہوں۔ جس سسرال کے سامنے تم فخر سے کھڑے رہنا چاہتے ہو وہاں تم گردن جھکانے کے لیے تیار نہیں ہو۔ یہی بات ہے نا؟ لیکن تم گردن کیوں نہیں جھکاؤ گے تمھارے پاس اب لڑنے کے لیے رہ ہی کیا گیا ہے؟ نہ پیسہ، نہ صحت۔ لیکن یہ سمجھ لو ایک بار ان سے معافی مانگ کر اور طلاق دے کے تم اپنی نئی زندگی شروع کر سکتے ہو۔ کم سے کم میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے۔“

سورج سر جھکائے ہوئے کھڑا تھا۔ آنسو پی کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں انھیں خوب جانتا ہوں۔ وہ بڑے نیچ اور جھگڑالو مزاج کے لوگ ہیں۔ وہ کبھی ایسا نہیں کریں گے جیسا آپ چاہتے ہیں۔“

”میں ان سے پکّا وعدہ لے آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ اپنی بات سے پھریں گے نہیں۔ وہ خود بھی اب جھگڑا ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی لڑکی کی کہیں اور شادی کریں گے نا!“

دکان پر جتنے لوگ اور تھے وہ اُن کی گفتگو سُن رہے تھے اُن سب نے ہیڈ کلرک کی تجویز کی تائید کی۔ سورج کو ایک بار وہاں چلے جانے کے لیے سمجھایا۔

ہیڈ کلرک سورج کو اپنی سائیکل کے پیچھے بٹھا کر چھ میل دُور راجندر نگر لے گیا۔

وہاں اس کی سسرال میں خاندان کے سب لوگ جمع ہو چکے تھے ۔ماں، باپ، چاچا، ناما، ماما۔ اسی گھر میں وہ کبھی اپنی بارات لے کر آیا تھا۔ بڑی دھوم، دھام کے ساتھ بینڈ باجوں، روشنیوں اور فلک شگاف آتش بازی کے ساتھ یہاں اس کا بڑا شاندار استقبال ہوا تھا۔ آج وہ ان کے نزدیک ایک کوڑی کی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ آج سے پہلے اس کے کتنے رشتے دار یہی درخواست لے کر آ چکے تھے ان لوگوں نے کوئی درخواست نہیں مانی تھی۔ اب وہ خود یہاں آیا تھا۔ اس بھروسے پر کہ اس کی خواہش پوری کر دی جائے گی۔

کمرے میں چاروں طرف کرسیوں اور صوفوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے اپنے سامنے معمولی کپڑوں میں اس کی مرجھائی ہوئی صورت دیکھی تو وہ بڑے طنزیہ انداز میں مسکرانے لگے۔ اسے لالچی کمینہ اور خود غرض کہہ کہہ کر اپنا غبار نکالنے لگے۔ وہ سب اتنے زور زور سے ہنسنے لگے کہ سورج کے لیے وہاں کھڑا رہنا بھی مشکل ہو گیا۔ اس کا ہیڈ کلرک اپنی جھولی پھیلا کر سب کے سامنے گڑگڑانے لگا لیکن سورج وہاں سے چلا آیا۔ ہیڈ کلرک کے روکنے پر بھی نہ رکا۔ اس کا دل ٹوٹ گیا۔ سر سے پاؤں تک ایک آگ میں جھلس گیا۔ یہ کسی بھی شخص کے لیے توہین کی انتہا تھی آخری حد تھی۔ اب تو جان دے کر ہی وہ اس توہین کو بھول سکتا تھا۔

اندھیری گلی میں اپنے پیچھے پیچھے اس نے کسی کے تیز چلنے کی چاپ سنی تو چونک گیا۔ پلٹ کر دیکھا کوئی عورت تھی دھوتی سے اپنا جسم ڈھانپے بڑے سلیقے سے بال سجائے اور آنکھوں پر نظر کا چشمہ چڑھائے وہ اس کے پاس آ گئی۔ سورج نے اسے حیران ہو کر دیکھا۔ شیلا کتنی بدل چکی تھی! وہ ایم۔ بی۔ ایڈ بھی کر چکی تھی۔ کسی پاٹھ شالا میں پڑھاتی بھی تھی۔ اُسے وہ چار سال کے بعد دیکھ رہا تھا۔ سورج نے اس کے سامنے خود کو بہت ہی حقیر محسوس کیا۔ وہ

ابھی تک وہی دسواں پاس ڈیڑھ سو تنخواہ پانے والا کلرک ہی تھا۔ شیلا نے بہت دھیرے سے کہا۔ "آپ سے کچھ کہنا ہے ادھر آجایئے۔ یہاں کوئی دیکھ لے گا۔"

"کوئی دیکھ لے گا تو کیا ہوا؟" سورج کو اچانک یہ سوچ کر بڑا تعجب ہوا کہ وہ اب بھی اُسے اپنی بیوی سمجھتا ہے۔ اپنا ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ اس کا دل خوشی اور ندامت سے بھرا ہوا تھا۔ مگر شیلا نے اپنے کندھے سے اس کا ہاتھ آہستہ سے ہٹا دیا۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولی: "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے آپ سے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ میں آپ کو سب کچھ لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں جو کچھ آپ چاہتے ہیں۔"

سورج کا جی چاہا اس کے پاؤں پر گر پڑے۔ "شیلا، میں یہ سب نہیں چاہتا۔" وہ گلوگیر ہو کر الفاظ کے لیے جدوجہد کرنے لگا۔ "تم کسی طرح میرے ساتھ نہیں چل سکتیں؟ ابھی اسی وقت! میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔ میں بہت دکھی ہوں۔" اس کے آنسو نکل پڑے۔

اسی وقت گھر کے سب لوگ بھی باہر آگئے۔ سورج کا ہیڈ کلرک بھی انھیں معلوم ہو گیا تھا۔ گلی میں سورج اور شیلا کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ وہ بہت ہی غصّے میں تھے، بڑے ہی جوش میں۔ جیسے سورج کی مار مار کر کھال ادھیڑ دیں گے۔ سچ مچ کوئی اس کی طرف بڑھا بھی۔ لیکن شیلا سب کے سامنے آگئی۔ "سر جھکا کر سورج سے بولی۔

"چلوں گی۔"

دُودھ

وہ سفر سے لوٹا تو گلی کوچوں میں پانی گھوم رہا تھا اور بارش ابھی تک جاری تھی۔ موسلا دھار۔ وہ گھٹنے گھٹنے پانی میں ڈوبا ہوا اپنے گھر تک پہنچا۔ کندھے پر اٹھائی ہوئی گٹھری کو ٹٹولا اور مالک کا شکر بجا لایا کہ اس کی دولت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا جو وہ کما کر لا رہا تھا۔

گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہی اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ اپنی حسین و جمیل بیوی سے ملنے اور اپنے اس بچے کو دیکھنے کے تصور سے جسے وہ صرف چند روز کا چھوڑ کر چل دیا تھا۔ اب وہ پانچ سال کا ہو چکا ہوگا! اس نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا۔ اب تو خوب شرارتیں کرتا ہوگا! عجیب پیاری پیاری باتیں کرتا ہوگا! ماں نے اسے بابا، بابا کہنا سکھا دیا ہوگا۔! پدری محبت سے سرشار ہو کر اس نے ایک بار پھر دروازے پر دستک دی، اور ذرا سے غصے کے ساتھ سوچا —— کیا اس کی بیوی سو گئی ہے؟

اسی لمحے اسے گھر کے آنگن میں بھرے ہوئے پانی میں کسی کے چلنے کی آواز

سنائی دی۔ یقیناً اس کی بیوی آرہی ہے! اس نے بیوی کی چاپ پہچان لی۔ وہ کس قدر بے صبری سے بھاگتی چلی آرہی ہے۔ اس نے اسی سے بیوی کی محبت کا اندازہ کیا اور دروازہ کھلنے سے پہلے اس کے بے مثال حسن کا تصور کر کے مسکرا دیا۔

دروازہ کھلا تو وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ اسی طرح خوب صورت اور دلکش نظر آئی جس طرح وہ سوچتا ہوا آیا تھا۔ اوپر آسمان پر بجلی چمکی تو اس کی روشنی میں اس کے جسم کی ساری دلآبیزی نمایاں ہوگئی۔ اس نے اس کی آنکھوں میں محبت کی وہ چمک بھی دیکھ لی جس کا وہ ہمیشہ سے متمنی رہا کرتا تھا۔

دونوں نے محبت سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے بہت ہی بے قراری سے اپنے بچے کی خیریت پوچھی۔

عورت نے اسے یقین دلایا "وہ بالکل خوش و خرّم ہے ابھی ابھی بڑی مشکل سے سویا ہے۔ تم شور مت مچاؤ نہیں تو جاگ جائے گا!"

وہ بچے کو ایک نظر دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کمرے تک دبے پاؤں پہنچا جہاں وہ سو رہا تھا۔ اس کے اوپر جھک کر دیکھا۔ وہ سچ مچ پانچ سال کا ہو چکا ہے۔ بہت ہی خوب صورت اور بالکل تندرست ہے! وہ خوش ہو کر مسکرا دیا اور پھر بڑی حقارت سے ان چار بچوں پر نگاہ ڈالی جو اس کے بچے سے ذرا فاصلے پر الگ الگ سو رہے تھے۔ اس کے بچے سے عمر میں بڑے تھے۔ ان چاروں کی عمر میں ایک تفاوت تھا۔ ان میں سے کسی ایک کی بھی شکل دوسرے سے نہیں ملتی تھی۔ وہ سب الگ الگ باپ سے تھے۔ لیکن ان کی ماں یہی عورت تھی۔ وہ اس کا پانچواں شوہر تھا۔ اس عورت کو حاصل کرنے کے لیے ہر ایک شوہر نے اس کے پہلے مرد کو مار ڈالا تھا۔ لیکن کوئی اس کے ایک بھی بچے کو اس سے دور نہیں کر سکا تھا۔ وہ عورت اتنی خوب صورت تھی کہ اس کی

خاطر قتل بھی کیا جا سکتا تھا اور بلاشبہ اس کی ہر خواہش کو پورا بھی۔ عورت اس کا آرام دہ گھر۔۔۔ دونوں ہی بہت پرکشش تھے۔ جس شخص نے اس عورت پر قبضہ کر لیا وہی اس کے گھر کا مالک بھی بن گیا۔

اپنے بچے کو دیکھنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں واپس آ گیا یہ کمرہ بہت ہی کشادہ تھا اور ہمیشہ بڑی نفاست سے سجا رہتا تھا۔ چاروں طرف بیش قیمت مورتیاں، تصاویر، جنگلی بھینسوں کے چمک دار نوکیلے سینگ اور شیروں وغیرہ کی کھوپڑیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ قدیم و موجودہ زمانے کے ہتھیار بھی بڑی احتیاط سے رکھے ہوئے تھے۔ یہ نوادر اس کے گزشتہ شوہروں کی یادگاریں تھیں۔ انھیں بھی اس عورت نے اپنے سے الگ ہونے نہیں دیا تھا۔ اگرچہ ہر شوہر نے آتے ہی انھیں چھین لینے اور برباد کر دینے کا ارادہ کیا لیکن پھر اس کی ضد اور خواہش کے سامنے جھک کر رہ گیا تھا۔

اس نے اپنی بیوی کے سامنے باہر سے لائی ہوئی دولت کی گٹھڑی کھول کر رکھ دی۔ جسے دیکھ کر وہ اس کی توقع کے مطابق خوش ہو کر مسکرانے لگی۔

عورت نے اس کے سامنے پینے کے کئی لوازمات رکھ دیئے۔ جنھیں اس نے بڑی لگن کے ساتھ تیار کرایا تھا طرح طرح کے لذیذ اور خوشبودار کھانے دیکھ کر وہ مسرت سے باؤلا سا ہوا اٹھا۔ عورت کو پہلو میں بٹھا کر شراب پینے لگا اور اپنے سفر کے حالات سنانے لگا۔

سفر کے دوران میں اس نے کئی حسین عورتیں دیکھی تھیں لیکن اس نے اعتراف کیا کہ کوئی عورت اس کی بیوی سے بڑھ کر حسین نہیں تھی۔

شراب پیتے پیتے وہ مدہوش سا ہونے لگا۔ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا عورت اتنی حسین کیوں ہوتی ہے؟ اس کے ہونٹوں میں شہد کی سی مٹھاس کیوں ہوتی ہے؟ اس کے جسم کی قوسوں میں کیسا جادو ہوتا ہے کہ۔۔۔!

وہ ایک گیت گانے لگا۔ اپنی زبان میں گیت۔ عورت اس کی زبان سمجھتی تھی۔ ساتھ رہ کر اس نے اپنے ہر ایک شوہر کی زبان سیکھی تھی۔ جب وہ اس طرح بدمست ہو کر گانے لگتے تھے تو وہ ایک معنی خیز خاموشی کے ساتھ سُنا کرتی تھی۔

اس کا شور سن کر ساتھ کے کمرے میں سوئے ہوئے سارے بچے جاگ اٹھے۔ گھبرا کر اسی کمرے میں چلے آئے اور آتے ہی ماں سے لپٹ گئے۔ اس نے اپنے بچے کو دیکھا تو خوش ہو کر اسے گود میں اُٹھا لیا اور اسے سینے کے ساتھ لپٹا لپٹا کر پیار کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "اوہ تم کتنے خوب صورت ہو! کتنے پیارے ہو! بالکل میری طرح ہو۔"

اس نے پلٹ کر اپنی عورت سے بھی پوچھا۔ "یہ بالکل میرا ہم شکل ہے نا!" عورت مسکراتی رہی۔ فخر اور بے بسی سے۔ بچہ اپنی ماں کی گود میں جانے کے لیے مچل اٹھا۔ رونے لگا تو باپ نے اسے پچکارا۔ "کیوں؟ کیوں؟ کیا ہوا میرے بچے کو؟ تم میری گود میں رہو نا! میں تمھارا باپ ہوں۔" بچے نے اپنی ماں کو پکارا اس سے اپنے اجنبی باپ کے بازوؤں میں سے نکال لینے کے لیے کہا۔ باپ نے اس کی آواز سنی مگر اس کی زبان نہ سمجھ سکا۔ بہت حیران ہوا پھر کسی قدر غصے میں آکر کہا "تو نے اسے بھی اپنی زبان سکھا دی ہے؟ میری زبان کا ایک لفظ تک نہیں سکھایا۔" اس کا نشہ ہرن ہو گیا۔ ساری خوشی غائب ہو گئی۔ بولا ــــ "تو اپنے طور طریقے خود اپنے اور دوسرے بچوں تک ہی رہنے دے۔ دوسرے بچوں سے کوئی سروکار نہیں لیکن میں اپنے بچے پر نہ ان کی چھاپ پڑنے دوں گا نہ تیری۔" عورت نے اپنے مرد کی طرف بڑی عجیب نظر سے دیکھا۔ جس میں قناعت تھی ایک انوکھا صبر۔ آنکھوں میں آنسو لا کر بولی ــــ "اس نے میری چھاتی کا دودھ پیا ہے۔ اس

بات کو تم کیوں بُھلا رہے ہو؟"

اور وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ بچے کو لے لینے کے لیے بازو پھیلا دیے۔ وہ بھی بچے کو دیر تک اپنے پاس روک نہ سکا۔ جب بچہ ماں کے پاس چلا گیا تو اس نے شراب کا ایک اور جام چڑھایا، اور بڑی خونخوار نظروں سے اپنی عورت کی طرف دیکھنے لگا۔

کن کھجورا

ٹرک ذرا دیر کے لیے کھنکار کر رک گیا۔ میں قریب پہنچا تو پھر چل پڑا۔ میں نے جستی ڈبے سمیت ہاتھ اٹھا کر ایک انگلی سے ناک کا بانسہ ملا اور پھر چلنے لگا۔

ایک بار —— ایک بار اور بھی ایک ٹرک مجھے اسٹیڈیم سے بٹھا کر میڈیکل کالج تک لے گیا تھا۔ کوئی کوئی ڈرائیور بہت بھلا ہوتا ہے۔ میں نے سر گھما کر دیکھا۔ حضرت گنج میل بھر پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ ویران، خاموش سیدھی سڑک بالکل خالی پڑی ہے۔ روز اس وقت خالی ہو جاتی ہے۔ جیسے کسی کی رات میں اچانک سورج جھانکنے لگے۔ روزانہ رین بو کیفے سے میں اسی وقت نکلتا ہوں، اسی طرح سوچتا ہوا گھر جاتا ہوں۔ چار میل تک کرتے پاجامے اور چپل میں لنگڑاتا ہوا۔ ہاتھ میں روٹی کا ڈبہ اٹھائے۔ خوشبودار مسالوں اور گھی کے باسی ٹھنڈے گوشت کی خوشبو نتھنوں میں گھسی ہوئی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ آج مرغے کی ایک ٹانگ بھی ہے۔ تاجاں ڈبہ کھولے گی تو خوش ہو کے گلے سے لپٹ جائے گی۔ ماتھر صاحب بہت نیک آدمی ہیں۔ ہم —— دو تین بیروں پر تو بہت ہی

مہربان ہیں۔ جو کچھ بچ جاتا ہے خوشی سے بانٹ لینے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ کبھی کبھی انعام کے طور پر، کیک، کلیجی، کٹلٹ، ہاٹ ڈاگ وغیرہ بھی ساتھ کر دیتے ہیں۔ جس دن ان کی آمدنی ایک ہزار سے اوپر ہو جاتی ہے صرف اسی دن۔

ریذیڈنسی کے سامنے پہنچ کر میں نے چپل اتار لی۔ ایک ہاتھ میں چپل دوسرے میں ڈبہ۔ اوپر تلے دو ڈبے۔ پسینے سے کرتا بدن کے ساتھ چپک گیا ہے۔ پاجامہ بھی برداشت سے باہر ہوا جا رہا ہے۔ لگتا ہے کہ ہوا بالکل رک گئی ہے۔ پتہ تک نہیں ہل رہا تھا۔ منہ اٹھا کر شہیدوں کی لاٹ کو دیکھتا ہوا چلنے لگا۔ خاموش سفید، کالی رات کے سینے میں گڑی ہوئی سنگین سی سنگین تو ہر روز میرے سینے میں اترتی ہے جب کوئی گالی دیتا ہے، کوئی نفرت کے ساتھ دیکھتا ہے۔

رِوَر بینک کالونی تک کوئی سواری نہیں ملی۔ پچھلے دس برسوں میں اس لمبے سنسان راستے پر کتنی بار تنہا چلا ہوں۔ لیکن مجھے تنہائی کا احساس نہیں ہوتا۔

ہائی کورٹ، اولڈ میوزیم، چھتر منزل، ریذیڈنسی، شہیدوں کی لاٹ، لوبے کا پل اور میڈیکل کالج میرے ساتھی ہیں۔ میرے انتظار میں راستہ روک کر کھڑے رہتے ہیں۔ ان سے میں دوستوں کی طرح ہاتھ ملا کر خیریت پوچھتا ہوا چلتا ہوں۔ کبھی کبھی گرمیوں میں جب باڑھ آ جاتی ہے تو میرے دوست کمر کمر تک پانی میں ڈوبے رہ جاتے ہیں۔ مجھ سے بچھڑ جاتے ہیں۔ تب میں امین آباد اور رکاب گنج کے راستے سے نکل جاتا ہوں۔

میڈیکل کالج سے آگے بڑھتے ہی ویرانی ختم ہو جاتی ہے۔ ایک دو بجے وکٹوریہ اسٹریٹ پر کوئی نہ کوئی آتا جاتا مل جاتا ہے۔ اس وقت دو سے اوپر ہیں۔ تین بجے سے صبح دس گیارہ تک میں لمبی تان کر سوتا ہوں۔ تاجیاں سے

کہہ رکھا ہے وہ اس سے پہلے نہیں اٹھاتی۔ خود ہی صبح اٹھ کر اپنا ناشتہ پانی کر لیتی ہے۔ پھر میرے لیے کچھ نہ کچھ بنا کر مجھے اٹھاتی ہے۔ نہاتے کھاتے دو بج جاتے ہیں۔ میں تین بجے پھر ریزیڈنس بو میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ سفید براق وردی میں ٹرے اٹھا کر صاحب لوگوں کی خدمت کرنے لگتا ہوں ——— "یس سر!"

میری جیب میں ایک سو بیس پیسے ہیں۔ کوئی کوئی ہی ٹپ دیتا ہے۔ ٹپ دینے کا رواج ختم ہو رہا ہے۔ مجھے بھی اچھا نہیں لگتا۔ ماتھر صاحب سے کہہ سن کر پانچ روپے تنخواہ بڑھوالی ہے۔ تیس روپیوں میں کچھ نہیں بنتا۔ کسی طرح ساٹھ روپے ہو جاتے۔ ٹپ کے لیے کسی کا منہ نہیں دیکھیں گے۔ میرے سامنے صاحب لوگوں کے چہرے گھومنے لگے۔

وہ ٹپ نہ دینے کی خاطر کاؤنٹر پر جا کر بل ادا کرتے ہیں۔ بعض ٹپ نہیں دیتے تو آنکھیں بھی جھکا لیتے ہیں۔ کوئی کوئی تو اس طرح بیلنس اٹھاتا ہے جیسے میرے ہاتھ سے چھین کر بھاگ جانا چاہتا ہو۔ اور کوئی چند پیسے چھوڑ کر اس طرح منہ بناتا ہے جیسے منہ پر طمانچہ لگانے کی حسرت اس کے دل ہی دل میں رہ گئی ہے۔ میرے سیاہ کلین شیو جھریوں والے چہرے پر ایسے کتنے ہی طمانچوں کے نشان ہیں۔ میں جبڑے ہلا کر خلا میں گھورنے لگتا ہوں۔ چھوڑے ہوئے پیسے واپس کرتے ہوئے بھی نہیں بن پڑتی۔ صاحب لوگوں کے ناراض ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ اور جب صاحب لوگ ناراض ہوتے ہیں تو ماتھر صاحب بھی ناراض ہو جاتے ہیں۔ اور جب ماتھر صاحب ناراض ہو جاتے ہیں تو گھر بار، بیوی اور سارا شہر ایک چکر کی مانند گھومنے لگتے ہیں۔

قیصر باڑی تک پہنچتے پہنچتے میں تھک کر چور ہو گیا۔ جی چاہا کہ وہیں کہیں بیٹھ جاؤں۔ پینتالیس سال سے اس طرح پیدل چلتے چلتے میرے جسم کا جوڑ جوڑ

تھک چکا ہے۔ موڑ پر نبی مل گیا۔ وہ شمشاد کو اپنے گھر پہنچا کر لوٹا ہے۔ اکثر اسی وقت لوٹتا ہے۔ اپنی کوٹھری میں ٹاٹ کے پیچھے کھاٹ لگا کر کئی مہینوں سے یہی دھندہ کر رہا ہے۔ رمضان کبابیے کی ماں دو چار گھنٹوں کے لیے کوٹھری کے سامنے برتن پھیلا کر انھیں راکھ اور پانی سے مل مل کر مانجھتی رہتی ہے۔ وہ اسے ہر روز ایک روپیہ دے دیتا ہے۔ کوٹھری کے سامنے برتن بکھرے دیکھ کر کوئی شک بھی نہیں کرتا۔ وہ خود ہی گاہکوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اندر لے جاتا ہے۔ آج تک کسی کو بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن آج مجھے پتہ چل گیا ہے۔ لیکن پھر بھی میں نے کبھی نبی کو جتایا نہیں ہے۔ مجھے کیا پڑی ہے۔

"غنی بھائی سلام علیکم"

اسے سلام کا جواب دے کر آگے بڑھ گیا۔ ڈھلوان، جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی اینٹوں والی گلی میں دونوں طرف نالی ہے۔ کنارے کنارے گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں بیچوں بیچ کہیں دیواروں کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی چارپائیوں پر لوگ سو رہے ہیں۔ میں ان چارپائیوں سے بڑھی ہوئی ٹانگوں سے ہمیشہ بچ کر چلتا ہوں۔ کہیں ٹکرا گیا تو فساد مچ جاتے۔ تاجاں کی بدسلوکی اور بدزبانی کا بدلہ وہ مجھ سے لے سکتے ہیں۔ جانتے ہیں میں زیادہ نہیں بولوں گا۔ تاجاں کو سنانے کے لیے ہی وہ کبھی کبھی عمداً میرے ساتھ لڑ پڑتے ہیں۔ تاجاں میرے خاموش رہنے پر بہت خائف ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ میرے لیے اس طرح لڑتی ہے جیسے کوئی ماں اپنے بچے کے لیے۔

ٹیڑھی میڑھی گلی میں مکمل اندھیرا ہے۔ اندھیرا اور سیلن۔ لڑکوں نے نکڑ والا بلب کبھی سلامت نہیں رہنے دیا۔ پتھر مار کر ہمیشہ توڑ ڈالتے ہیں۔ اندھیرے کے کئی فائدے ہیں۔ ٹھنڈا ہوتا ہے۔ نیند خوب آتی ہے۔ جو کبھی کبھی ایک ہی چارپائی

پر اکٹھے ہو جاتے ہیں تو کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔ اندھیرے کو ٹٹولنے کی کوشش نہ کی جائے۔ یہ چادر بھی ہے چار دیواری بھی۔ جب میں بڑی احتیاط کے ساتھ راستہ دیکھ دیکھ کر چل رہا تھا۔ تو وہ سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے تھے۔ جب میں نکل آیا تو پیچھے سے کنجر نے سرگوشی کی "سالا غنی ہی ہے۔ روز اسی وقت آکر مرتا ہے۔"

لکھوری اینٹوں والے گرے پڑے مکانوں کے ایک کمرے کے کئی مکان ہیں بنا دروازوں کے۔ ہر دروازے پر ٹاٹ کے پردے لہرایا کرتے ہیں۔ یہاں ٹاٹ زندگی کا ایک ضروری جز ہے۔ لیکن ٹاٹ لگا کر بھی کچھ نہیں چھپا پاتے۔

میں اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔ چبوترے کے نیچے دیوار کے ساتھ کھٹیا ڈال کر تاجاں گہری نیند سو رہی ہے۔ گٹھڑی سی بنی ہوئی۔ دن بھر سب کے ساتھ گالی گلوچ کی ہے اب مزے سے خراٹے لے رہی ہے۔ لڑنا جھگڑنا اس کی فطرت میں ہے۔ ایسا نہ کرے گی تو اس کا کھایا پیا کیسے ہضم ہوگا! جمعدارن سے لے کر پرلے سرے پر ٹین کے ڈبے بنانے والے مولبی صاحب تک کے ساتھ تو اس کا بیر رہتا ہے۔ چبوترے پر بیٹھ کر ایسے اطمینان سے ٹر ٹر کیے جاتی ہے جیسے ڈنگر پیٹ بھر کر جگالی کیا کرتے ہیں۔ بیس سال سے اس کے ساتھ ہوں۔ اتنے جھگڑوں کے باوجود بڑی خاموشی سے کٹ رہی ہے۔ میں اسے کبھی نہیں ٹوکتا۔

اندر جا کر ڈبہ دیوار پہ لٹکا دیا۔ کرتہ پاجامہ بھی رسّی پر پھینک دیئے۔ تہمد باندھ کر چبوترے پر آ بیٹھا۔ تاجاں نے میری لیے دری بچھا رکھی ہے۔ اسے خبر ہی نہیں میں آ گیا ہوں کبھی کبھی تو وہ جاگ کر اٹھ بیٹھتی ہے۔ بھوک نہ ہونے پر بھی ڈبہ کھول کر بیٹھ جاتی ہے کبھی کبھی پڑی سوتی رہتی ہے۔

میں نے بیڑی سلگائی۔ دھیمے دھیمے کش لینے لگا۔ اپنے سامنے کھٹیا پر

گٹھری بنی ہوئی تاجاں کو بھی دیکھتا رہا۔ اندھیرے میں بھی یہ گٹھری لگا ہوں میں کھُب جاتی ہے۔ رات کو اس وقت لوٹ کر میں نے کئی بار اس گٹھری کو کھولا اور بند کیا ہے۔ ہم دونوں کی آپس میں بہت کم بات چیت ہوتی ہے۔ آس پاس کتنی چارپائیاں ہیں۔ کچھ لوگ زمین پر بھی لیٹے رہتے ہیں۔ ایک بار ستّو کے باپ کے بدن پر کن کھجورا چڑھ گیا تھا۔ لیکن یہ لوگ کیڑے مکوڑوں کی پروا نہیں کرتے۔ یہاں انسان اور کیڑے مکوڑے ایک ہی طرح رہتے ہیں۔

اب کوئی نہیں جاگ رہا ہے۔ کونے والی بڑھیا بھی کھانس کر خاموش ہو گئی ہے۔ میں نے بیڑی سے آخری کش کھینچا۔ پھر اسے نالی میں پھینک دیا۔ بجھنے کی ایک ہلکی سی آواز آئی۔ پھر بیڑی ڈوب گئی۔ میں دھیرے دھیرے سے چبوترے پر سے اترا۔ ڈھیلی ڈھالی کھٹیا میں گھس، گٹھری کو ٹٹولا۔ وہ میرے ہاتھوں کا لمس پاتے ہی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ ہولے سے غرائی ”کیا ہو گیا ہے تمھیں؟ کچھ کھا والیا ہے کیا؟“

اس نے تو میرا کبھی ہاتھ تک نہیں چھوا کا ہے۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ لیکن ہنسی کو منہ کے اندر دبا کر اس کا چہرہ ٹٹولا۔ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اِدھر اُدھر احتیاط سے دیکھا۔ اس نے میرا ہاتھ پھر ہٹا دیا۔ پھر غرّائی —— ”کتنی بار میری ہڈیاں چچوڑو گے؟ ابھی ابھی تو —— ! میرے اندر رکھا ہی کیا ہے؟“

میرے بدن پر کوئی کنکھجورا رینگ گیا ہو جیسے! غصّے سے بے قابو ہو کر پھٹ پڑا ”کیا بک رہی ہے؟ میں تو ابھی چلا ہی آ رہا ہوں!“

میری آواز کچھ اونچی تھی۔ وہ بالکل سناٹے میں آ گئی۔ آس پاس لیٹے ہوئے لوگوں نے کروٹیں بدل بدل کر ہمیں گھورا۔ میں نے پھر پوچھا ”بول! کون تھا وہ؟“ وہ خاموش نہ رہ سکی۔ چلّا پڑی ”میں کیا جانوں! تمھاری طرح پہلے اندر جا کر

کھٹ پٹ کرتا رہا۔ پھر چبوترے پر بیٹھ کر بیڑی پی۔ پھر اتر کر میرے پاس آلیٹا۔ امرداراہ کمینہ، کتا۔ میں تو تم ہی کو سمجھ کر خاموش پڑی رہی تھی۔" وہ زور زور سے رونے بھی لگی۔
اس کی آواز اتنی اونچی تھی کہ دور دور کے لوگ جاگ اٹھے۔ کچھ وہیں بیٹھے رہے۔ کچھ ہمارے سامنے ہو ہو کر ٹولیوں میں کھڑے ہو گئے۔ اندھیرے میں کئی بیڑیاں پی گئیں۔ کئی لوگ کھانسے۔ کئی لوگ ہنسے۔ تاجاں کی وجہ سے کسی نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا لیکن وہ تب بھی گالیاں دیے جا رہی تھی۔ "کنجر! خنزیر کے بچے!"
یکایک میں نے اس کی کھٹیا الٹ دی۔ جیسے کسی کتے کی دُم پر پاؤں آجائے۔ اور وہ کاٹنے دوڑے۔ وہ چلاتی رہی اور میں چبوترے پر جا بیٹھا۔ پیروں کے بل۔ گھٹنے ملا کر ان پر ٹھوڑی گاڑ دی۔ میرے بدن کی جلد میں کن کھجورے نے اپنے سارے نکیلے پاؤں گاڑ دیے تھے۔ میں نے جیب میں دیا سلائی ٹٹولی۔ سدّو کے باپ کے بدن پر جو کن کھجورا چپکا تھا اسے آگ سے جلا کر ہی الگ کیا جا سکا تھا۔ مجھے اس کا بلبلانا یاد آ گیا تھا۔

تصادم

"باپ رے باپ! اتنی لاشیں!"

ریلیف ٹرین سے باہر آتے ہی بھگولے گھبرا اٹھا۔ سامنے ٹوٹی ہوئی گاڑیوں کا ملبہ بکھرا ہوا تھا۔ ملبے کے اوپر نیچے بے شمار انسانی جسم پڑے تھے۔ خاک و خون میں اٹے ہوئے۔ کچھ جسم لکڑی کے تختوں کی مانند ٹوٹے و تڑخے ہوئے تھے۔ کچھ لوہے کی چادروں و سلاخوں اور سپرنگوں کی طرح گول مول سے ہو گئے تھے۔ کہیں کہیں بے سر کے دھڑ بھی تھے۔ کہیں کہیں صرف باہیں، ٹانگیں اور کھوپڑیاں۔

مدد پہنچانے والی گاڑی سے اترنے والے امدادی دستے کے قریب قریب ہر ایک شخص نے خوف اور گھبراہٹ کے مارے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے اپنے خدا کو یاد کیا کسی نے بھگوان کو۔ کچھ دیر بعد انھوں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں پھر کھول لیں۔

دور تک ——— جہاں سے چھوٹے ریلوے اسٹیشن مسیت کی حدود شروع ہوتی تھیں اور جہاں پہ حدود ختم بھی ہو جاتی تھیں آپس میں ٹکرائی ہوئی دونوں

گاڑیوں کا ملبہ پھیلا ہوا تھا۔ لگتا تھا یہ حادثہ زمین پر پیش نہیں آیا ہے۔ کسی انجانی قوت نے یکایک اوپر سے یہ ملبہ اور لاشیں برسادی ہیں!

آس پاس کے کتنے ہی دیہات کے لوگ اور مختلف تھانوں و پولیس چوکیوں کے سپاہی گھیرا ڈالے خاموش کھڑے تھے۔ اب کوئی آگے نہیں بڑھتا تھا۔ جب صبح کے کہرے میں مال گاڑی کے ساتھ سواری گاڑی ٹکرائی تھی تب ان سب نے خوب لوٹ مار مچائی تھی۔ وہ زخمیوں اور مُردوں کی جیبیں اور ان کا سامان ٹٹولتے پھرتے تھے۔ جو کچھ کسی کے ہاتھ لگ سکا اُسے وہ لے اڑا تھا۔ اب وہاں لوٹے جانے کے لیے کوئی چیز نہیں رہ گئی تھی۔ پہلی ریلیف ٹرین زخمیوں اور زندہ بچ جانے والے مسافروں اور ان کے سامان کو یہاں سے چند گھنٹے پہلے لے جا چکی تھی۔ یہ ٹرین جو اب آئی تھی صرف مُردوں کو لے جانے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ اس میں جتنے لوگ تھے وہ سب کے سب پولیس کی کڑی نگرانی میں لے آئے گئے تھے۔ اس بات کا بڑا اندیشہ تھا کہ یہ لوگ یہاں تک نہیں آئیں گے۔ کہیں راستے ہی میں گاڑی کی زنجیر کھینچ کر اتر جائیں گے یا یہاں پہنچتے ہی بھاگ نکلیں گے۔

اس حادثے کی خبر پہنچتے ہی چالیس میل دور کے ایک بڑے اسٹیشن کے قلیوں اور پورٹروں نے اپنی وردیاں اور نمبر اتار کر چھپا دیے تھے۔ لاشیں اٹھانے کے لیے انہی کو پکڑ کر لے جائیں گے۔ پولیس پچاس ساٹھ قلی، پورٹر اور خاکروب گھیر کر لے آنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اب وہ ملبے کے سامنے کھڑے بڑبڑا رہے تھے۔ مُردے اُٹھانا کون بڑا بھاری کام ہے! لیکن یہ مسافر تو ایسے خوفناک طریقے سے مرے ہیں کہ ان کی طرف نظر اٹھاتے ہوئے بھی جی ڈوبتا ہے! باپ رے باپ!

میکو اپنی مضبوط باہوں میں جس عورت کی لاش اُٹھا کر لایا، بھگولے اس کے جوڑے میں اٹکا ہوا گلاب کا پھول غور سے دیکھنے لگا۔ جو ابھی تک خوشبو

دے رہا تھا، جو ابھی تک سرخ تھا لیکن اس عورت کے چہرے کی ساری تازگی اور شادابی زردی میں بدل چکی تھی۔ صرف اس کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں جنہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا مرنے سے پہلے آخری لمحوں میں وہ کسی کی طرف بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی اس کے دونوں بازو کھلے ہوئے اور اوپر کی طرف مڑے ہوئے تھے۔ بے ترتیبی سے اُگے ہوئے ناگ پھنی کے پودوں کی مانند! بھگولے نے اسے میکو کے ہاتھوں میں لے کر چپ چاپ ایک جگہ لٹا دیا۔

میکو ایک اور کی لاش لے کر آیا۔

"یہ تو اپنا ہی کوئی ساتھی لگتا ہے۔ کیوں میکو!" بھگولے نے اسے اپنے بازوؤں میں سنبھال کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

میکو اس کی بات سن کر رک گیا۔ بھگولے کی طرف غور سے دیکھا جو نیلے کپڑوں اور کھلے ہوئے سر والی لاش کو اوپر کے تختے پر لٹا رہا تھا۔ جب اُسے لٹا چکا تو اس کی کمر کے نیچے اکٹھا ہو گئے ہوئے ناریل کے ریشوں کو بھی سیدھا کر دیا۔ اور بڑبڑایا۔ "تو یہاں اوپر لیٹ رہے! مر کر بھی اوپر نہ لیٹا تو پھر کب سکھ پائے گا!"

جس ڈبے میں وہ دونوں کام کر رہے تھے پہلے درجہ کا آٹھ پہیوں والا ایک پرانا ڈبہ تھا۔ اوپر کے تختوں پر اب بھی کہیں کہیں ناریل کے ریشے اور ہرے رنگ کا آئل کلاتھ چپکا رہ گیا تھا۔ بھگولے نے چند لاشیں اٹھا کر اوپر کے نرم تختوں پر رکھ دیں۔ ایسی لاشوں کو نیچے پڑا رہنے دیا جن کے بدن پر نسبتاً قیمتی اور اچھے کپڑے تھے لیکن اب اس کے چہرے پر سے وہ پہلا سا خوف دور ہو چکا تھا۔ خوف کی بجائے ایک سختی سی دکھائی دینے لگی تھی۔ اس نے جان لیا تھا اُسے یہ کام کرنا ہی ہو گا۔ اسّی نوّے لاشوں میں سے وہ جتنی بھی اٹھا سکے گا اس کے لیے اُسے

کوئی انعام تو نہیں ملے گا لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو اسے نوکری سے ضرور الگ کر دیا جائے گا۔

چار ڈبوں کی گاڑی میں جو پچاس ساٹھ آدمی کام کر رہے تھے ان کے اوپر کئی پولیس افسر اور سپاہی ابھی تک سخت نگرانی رکھے ہوئے تھے۔ وہ بار بار انھیں شاباشیاں بھی دے رہے تھے اور دھمکاتے بھی جاتے تھے۔ ایک بار تو بھگولے نے جھلا کر پولیس انسپکٹر کے ہاتھ سے کالے ساگوان کا ڈنڈا چھین کر دور پھینک دیا جسے وہ ہر چند منٹ کے بعد گاڑی کے دروازے پر آ کر بجانے لگتا تھا۔ اس نے کہا، "صاب! یہ آپ ہمارا مغز کیوں چاٹ رہے ہیں؟ جایئے وہاں ایک طرف کھڑے ہو کر دیکھیے نا۔"

پولیس انسپکٹر پر سکتہ سا طاری ہو گیا لیکن جلدی اپنے اوپر قابو پا کر وہ وہاں سے چپ چاپ کھسک گیا۔

تین چار گھنٹوں کی کڑی اور صبر آزما محنت کے بعد بھگولے اور میکو نے اس بوگی میں تیس پینتیس لاشیں لاد دیں جن میں بچوں کی بھی تھیں عورتوں کی بھی اور مردوں کی بھی۔ ان دونوں کے چہروں سے اب ہمدردی بھی جھلکنے لگی تھی۔ ایک گہرے دکھ کا احساس بھی تھا۔ خوف، بےبسی، سختی اور درشتی غائب ہو چکی تھی۔ بہت دیر تک انھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کوئی بات بھی نہ کی۔ بولتے بولتے وہ اچانک خاموش ہو گئے تھے۔ کافی دیر خاموش رہنے کے بعد اب وہ کوئی بات کرتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ جب میکو ملبے کے نیچے سے دو کٹے ہوئے بازو اٹھا کر لے آیا اور دروازے پر رک کر کہا —— "لے بھگولے انھیں بھی ایک طرف رکھ دے!" تو بھگولے کو اس کی آواز بہت عجیب سی معلوم ہوئی۔ جیسے اسے گمان تک نہ ہو سکتا تھا کہ وہاں اب کوئی آواز بھی سنائی دے سکے گی۔ خود میکو نے اپنی آواز کو اجنبی سمجھا۔ جس تھرتھراہٹ نے اسے چونکا دیا وہ اس کی اپنی ہرگز نہیں تھی!

بھگولے نے دونوں بازو فرش پر رکھ دیئے۔ ایک تو ننگا تھا۔ دوسرے کے ساتھ خون اور خاک سے لتھڑی ہوئی کوٹ کی آستین لٹک رہی تھی۔ بھگولے نے اسے کھینچ کر الگ کر دیا۔ دونوں بازو ایک جیسے ہو گئے۔ بھگولے انھیں بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ان جسموں کی طرف بھی غور سے دیکھا جن کے ساتھ بازو نہیں تھے۔ بغیر بازوؤں کے جسم عجیب سے معلوم ہوتے تھے۔ اگر سچ مچ جسم کے ساتھ بازو نہ ہوتے تو یہ دنیا کتنی ادھوری ہوتی۔

اس نے دونوں بازو اٹھا کر ایک ایسے جسم کے ساتھ رکھ دیئے جس کے بازو کٹ گئے تھے۔ بازوؤں کے ساتھ لگتے ہی اس جسم کی ہیئت بدل گئی۔ جیسے کوئی رُکی ہوئی مشین اچانک حرکت میں آجائے۔ یہ دیکھ کر بھگولے کے چہرے کی کیفیت کچھ اور بدلی۔ افسردگی اور ہمدردی کی جگہ ایک طرح کی طمانیت نے لے لی۔ اس نے کچھ سوچ کر دونوں بازوؤں کو باری باری ان جسموں کے ساتھ رکھا جو بغیر بازوؤں کے تھے۔

"بھگولے کیا کر رہا ہے تو؟" میکو نے نیچے زمین پر سے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر پکارا۔ وہ میکو کی طرف دیکھے بغیر ہی ڈبا ڈبا سا بولا ـــــ "دیکھ تو میکو!"

لیکن میکو وہاں سے جا چکا تھا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا تو دروازے کے پاس ایک سر رکھا نظر آیا۔ الگ۔ کٹا ہوا۔ یہ دیکھ کر بھگولے چونک پڑا۔ بڑی احتیاط سے جسموں پر سے پھلانگتا ہوا وہاں گیا۔ سر کے پاس بیٹھ کر چلّایا۔

"ارے یہ تو شمبوا ہے!! اے میکو رے! شمبوا کو پہچانا نہیں!"

"ہاں ہاں پہچانا ہے! اتنی زور سے کیوں چلّاتا ہے؟" میکو نے

دور سے ملبے کے نیچے کچھ ڈھونڈتے ہوئے جواب دیا۔

بھگولے نے سٹکتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا اور ان لاشوں کی طرف دیکھنے لگا جن کے ساتھ سر نہیں تھے۔ ایسی تین لاشیں تھیں۔ وہ سوچنے لگا ان میں سے کون سا دھڑ شمی کا ہو سکتا ہے؟ شمی احاطہ بندے خاں کا ایک سبزی فروش تھا۔ پان دریبہ کے باہر فٹ پاتھ پر ترکاری کا چھابہ لگایا کرتا تھا۔

"تو کہاں آن مرا ہے رے!" بھگولے بڑبڑایا۔

ان تینوں دھڑوں پر کوٹ اور بنیان چڑھے ہوئے تھے۔ شمی تو لنگی اور قمیص ہی پہنا کرتا تھا۔ شمی کا سر ان تینوں دھڑوں کے ساتھ لگ کر انہی جسموں کا ہی معلوم ہوا۔ یہ دیکھ کر بھگولے کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ بس لمحہ بھر کی مسکراہٹ۔ پھر وہاں میکو آ گیا۔ لاتعلق سا، دروازے میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ جب بھگولے کو ابھی تک شمی کا سر اٹھائے کھڑے ہوئے دیکھا تو کچھ حیران ہوا۔ لیکن تھکی تھکی آواز میں، بولا: "اسے کہیں رکھ کیوں نہیں دیتا؟ لا بیڑی نکال۔ بالکل دم ٹوٹ رہا ہے!"

بھگولے نے شمی کے سر کو ایک کونے میں ٹکا دیا۔ چوبی دیوار کے ساتھ رگڑ رگڑ کر ہاتھ پونچھے اور پھر کرتے کی جیب میں سے ماچس اور بیڑی ڈھونڈتا ہوا میکو کے پاس آ بیٹھا اور شمی کے سر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا: "پرسوں اس نے مجھے بارہ آنے واپس نہیں کیے تھے۔ کہتا تھا چینج نہیں ہے۔ پھر لے لینا۔"

آبلہ

اچانک خاموشی چھا گئی۔ گولی چلنی بند ہو گئی۔ لوگوں کی چلّاہٹ بھی سنائی نہیں دی۔ اس نے درز میں سے تاکا۔ یہ درز کاٹھ کی تختیوں میں بنی ہوئی تھی۔ کھڑکی پر پٹ نہیں تھے۔ یہی تختیاں تھیں۔

اُسے سامنے کوئی بھی نظر نہ آیا۔ کوئی زندہ شخص جس کو اس نے مار نہ دیا ہو۔ وہ ابھی تک سڑک پر پڑے تھے۔ چار وردی پوش سپاہی۔ اُنھیں اٹھانے کی بھی کسی نے ہمّت نہیں کی تھی۔ تین آدمی اس کے محلّے کے تھے۔ وہ بھی اس کے ہاتھوں سے مرے تھے۔ وہ ابھی تک سڑک پر پڑے تھے۔ کچھ دن پہلے کسی کو معلوم نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے کے ایسے جانی دشمن بن جائیں گے۔ وہ ہر روز ہی بالکل معمول کی طرح ایک دوسرے سے ملتے تھے یا سامنے آجاتے تھے۔ کبھی کبھی مزاج پُرسی کرتے تھے۔ کبھی بڑی خاموشی سے پاس سے گزر جاتے تھے۔

خون کی پیاس اچانک بڑھ گئی تھی۔ جیسے باؤلے ہو کر وہ اس کی

اور اس کے فرقے کے لوگوں کی جان لینا چاہتے ہوں۔ لیکن وہ ان کے ہاتھ نہیں لگ سکا تھا۔ جو لوگ ہاتھ لگ گئے تھے۔ ختم ہو چکے تھے۔ سڑکوں پر، گلیوں میں، مکانوں میں، دفتروں کی سیڑھیوں پر۔ جہاں وہ روزانہ بڑے اطمینان سے گھومتے تھے لیکن اب مرے پڑے تھے۔ اب وہ کبھی دفتر میں نہیں آئیں گے کبھی خوانچہ اُٹھا کر گلی میں صدا نہیں لگائیں گے۔ نہ اس دھرتی کے گیت گائیں گے۔ جس پر وہ پیدا ہوئے تھے۔ نہ اس تبدیلی کے بارے میں گفتگو کریں گے جو ان کے سروں میں بسی ہوئی تھی۔ خوابوں میں۔ سینوں میں۔

مارو، مارو!

مارو، مارو!

یہ شور کتنا عجیب ہے! کانوں سے ٹکراتا ہے۔ اور جسم کے اندر کچھ اُبلتا ہوا سا لگتا ہے۔ پھر آنکھیں جیسے بند ہو جاتی ہیں۔

"مارو"

وہ دیوار کے ساتھ لگ کر چند لمحوں سے زیادہ دیر تک نہ بیٹھ سکا۔ بے چینی، بے بسی، خوف اور دلیری نے اس کا چہرہ سخت خوفناک بنا دیا تھا۔ اتفاق سے اس کے ہاتھ بندوق اور گولیاں لگ گئی تھیں۔ وہ ان کا استعمال جانتا تھا۔ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے کچھ آدمی مار ڈالے تھے۔ یہ سوچ کر اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی تھی۔ جن لوگوں کے ساتھ وہ تین دن تک بنا کچھ کھائے پیے ایک مکان کے اندر بند رہا تھا۔ وہ اب اس کے ساتھ نہیں تھے۔ پتہ نہیں کہاں تھے۔! شاید بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو چکے ہوں! شاید مار ڈالے گئے ہوں! وہ

بھی اس وقت مر چکا ہوتا اگر اس کے ہاتھ بندوق نہ آئی ہوتی۔

اس نے گردن گھما کر کھڑکی کی طرف تاکا۔ تختوں پر انگریزی صابون کے جابجا چھاپے لگے ہوئے نظر آتے اور وہ اسی کو گھورتی ہوئی سی لگی۔ باہر آسمان بالکل صاف تھا۔ بادل کی ایک بھی ٹکڑی نہیں تھی۔ بہت سی چیلیں اونچائی میں چکر لگا رہی تھیں۔ نہ جانے دوپہر کے کتنے بجے ہیں!

اُسے پھر بھوک ستانے لگی۔ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے جان بچانے کی خاطر قتل کرنے میں مصروف ہے۔ کتنی ساری چھتیں کود کر یہاں تک پہنچا ہے۔

اسے اپنے سامنے ایک منڈیر کے پیچھے تین چار سر ہلتے ہوئے نظر آئے۔ اس نے بجلی کی سی سرعت سے ایک گولی داغ دی۔

ایک آدمی بڑے کرب سے اچھلا۔ چیخا اور پھر دھم سے گر پڑا۔ اس نے اپنے ہونٹ کاٹ لیے۔ وہ اس کمرے کے اندر کتنی دیر تک رہ سکے گا؟ رات کے اندھیرے میں چاروں طرف سے لوگ گھس پڑیں گے۔ اس کے پاس چار گولیاں بچ رہی ہیں۔ بس صرف چار۔ اب اس کا مارا جانا یقینی ہو چکا ہے۔

اس نے پیٹ میں ایک عجیب سی اینٹھن محسوس کی۔ بھوک اور پیاس کی۔ اور سخت نقاہت کی۔

ایک گولی سے وہ خود کو مار ڈالے گا۔ آخری گولی سے۔ اس نے چاروں گولیوں کو دیکھا۔ انھیں ہاتھ سے چھُوا۔ ایک گولی کا انتخاب کیا۔ جو اُسے ختم کر دے گی۔ لیکن پھر اس گولی کو باقی تین کے ساتھ ملا دیا۔ چاروں پھر مل گئیں۔ پتہ نہیں وہ کون سی تھی؟ اُسے ڈھونڈنے میں ناکام رہا۔

اچانک "دھائیں!!" کی ایک اونچی آواز سنائی دی۔ کسی چیز کے ٹوٹنے اور ٹوٹ کر بکھرنے اور گرنے کی۔ اس نے حیرت زدہ ہو کر ان لوگوں کو

تلاش کیا۔ وہ بھی کہیں دبک گئے تھے۔ اچانک اس کی سمجھ میں ساری بات آ گئی انھوں نے اسی کمرے کی طرف گرینڈ پھینکا تھا جو اتنی دور تک نہیں پہنچ سکا۔ گلی میں ہی گر کر پھٹ گیا تھا۔ وہ اس خیال سے ڈر گیا کہ اگر گرینڈ چھت پر آ گرا ہوتا تو وہ اس وقت ملبے کے نیچے مرا پڑا ہوتا!!

اس نے بندوق کی نالی اسی منڈیر کی طرف سادھ لی۔ اب کوئی ہلا تو وہ گولی مار دے گا۔

کتنی دیر تک بالکل سناٹا رہا۔ پھر اچانک بہت دور سے لوگوں کا شور سنائی دیا۔ انھوں نے اپنا مذہبی نعرہ بلند کیا تھا جیسے وہ بہت ہی وحشیانہ طریقے سے چیخ رہے ہوں! جیسے بہت سے جنگلی انسانی سروں کا شکار کرنے نکل پڑے ہوں۔ متوقع کامیابی کی خوشی میں اچھل اچھل کر ناچ رہے ہوں۔

کافی دیر تک کوئی دکھائی نہ دیا۔ اس نے سر گھما کر کمرے کے اندر نگاہیں دوڑائیں۔ یہاں آخر کھانے کے لیے کوئی چیز کیوں نہیں ہے؟ وہ معمولی سے سامان کو جو ایک خالی الماری۔ ٹوٹی ہوئی چارپائی اور میز اور چند خالی پیٹیوں پر مشتمل تھا کتنی دیر تک ایک بچے کے سے گرسنہ استعجاب کے ساتھ دیکھتا رہا۔ پھر اچانک اس نے اچھل اچھل کر ایک خالی ٹین کو بڑے زور سے ٹھوکر لگائی۔ ٹین اپنی جگہ سے اچھل کر چھت کے ساتھ جا ٹکرایا۔ اور پھر وہیں اسی فرش پر گر کر ساکن ہو گیا۔ وہ جبڑا کسے کتنی دیر تک اس گونج کو سمجھنے کی کوشش میں لگا رہا جو ٹین کو ٹھوکر مارنے سے پیدا ہوئی تھی۔ اور پھر اچانک ہی ایک دھماکے سے کھڑکی پر کیلوں سے جڑی ہوئی صابون کی پیٹیوں والی تختیاں ذرہ ذرہ بن کر اڑ گئیں۔ ہر طرف

بکھر گئیں۔ وہ فرش پر لیٹ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

اس بار اس نے جو گولی چلائی وہ منڈیر کے ساتھ ہی ٹکرا کر رہ گئی۔ ایک اینٹ کے ٹکڑے اُڑے اور بس! اسے گولی کے ضائع ہو جانے کے لیے افسوس ہوا۔

اچانک اُس نے بہت سی مشینوں کی ایک ساتھ چلنے کی آواز سُنی۔ اُس آواز کو سمجھنے کی کوشش میں اُس نے اپنے سارے وجود کو بے حرکت کر لیا۔ اُس لمحے اُس نے کسی کے پُکارنے کی آواز بھی سُنی۔

سامنے کی چھت پر سے اُسی کو پُکارا جا رہا تھا۔ اس سے نیچے اُتر آنے کے لیے کہا جا رہا تھا۔ اور اُسے دھمکایا جا رہا تھا کہ وہ مکان سمیت توپ سے اڑا دیا جائے گا۔

وہ ٹینک لے آئے تھے۔ ٹینک پر ایک چھوٹی سی توپ نصب تھی۔ توپ کا ایک ہی گولہ مکان کو تہس نہس کر سکتا ہے۔

وہ جلدی سے دروازے کی طرف سرکا۔ بلّی کی سی مکّاری اور ہوشیاری سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک جست میں وہ چار فٹ دور دیوار کے پار جا سکتا ہے۔

اس نے بندوق دیوار کے اس طرف پھینک دی اور خود بھی اسی لمحے کے اندر کود گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے کئی گولیاں ایک ساتھ چلیں۔ لیکن وہ ان کی زد سے باہر پہنچ چکا تھا۔

خالی صحن میں اسے دو بیل دکھائی دیئے جو اُسے دیکھ کر بڑی محبت سے سینگ ہلانے لگے تھے۔

اُس نے اپنی جیب کو چھُوا تو سُن سا ہو کر رہ گیا۔ جو تین گولیاں

بچی ہوئی تھیں۔ وہ وہیں چھت پر رہ گئی تھیں! اسے اپنا انجام بالکل قریب معلوم ہوا۔ بس کسی بھی لمحے میں وہ ختم ہو جائے گا۔

بیلوں نے پھر سینگ ہلائے تو اس نے زور سے بندوق اُن کی طرف پھینکی۔ جو ایک بیل کے سینگوں کے ساتھ ٹکرا کر ان کے آگے پڑی ہوئی خالی پیٹی میں گر گئی۔

وہ جلدی جلدی مکان کے اندر گھوم پھر کر کوئی چیز تلاش کرنے لگا۔ اس مکان میں رہنے والے لوگ جا چکے تھے۔ وہ انھیں جانتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ ان کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔

اچانک وہ چارا کاٹنے والے ٹوکے کے پاس رک گیا۔ جلدی جلدی اس کا معائنہ کیا۔ اور پھر اس کے ایک حصّے پر پاؤں جما کر اس کے دو حصے کر ڈالے۔ اس کا دستہ ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دستے کے ساتھ لوہے کا وزنی پھل تھا۔ جو ایک ہی ضرب میں کسی کا کام تمام کر سکتا تھا۔

اس نے دروازہ کھول دیا۔ گلی کے پار اسے ایک مکان کا ذرا سا کھلا ہوا دروازہ دکھائی پڑا۔ جس میں سے ایک بچّہ بڑی حیرت سے باہر دیکھ رہا تھا۔

وہ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ گلی پار کر گیا۔ اور مکان کے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ لوگوں نے اسے دیکھ کر شور بلند کیا، اور مکان کی طرف دوڑ پڑے۔

اُس نے جھک کر دیکھا بچّہ سہما سہما اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ حیران ہوا۔ اس گھر میں اکیلا ہے؟ بالکل اکیلا!

ایک جگہ دیوار کے ساتھ نل لگا نظر آیا۔ چل رہا تھا۔ پانی بھیگے ہوئے کپڑوں کے ایک ڈھیر پر گر رہا تھا۔ وہ بچے کو چھوڑ کر نل پر گیا۔ جی بھر کر پانی

پیا۔ پھر ہاتھ کی پشت سے منہ پونچھتا ہوا لوٹا تو بچّے نے اچانک رونا شروع کر دیا
چلتے چلتے وہ صحن کے عین درمیان پہنچ گیا۔ بچّے کے پاس ہی پیروں کے بل بیٹھ گیا
بڑی غم ناک نگاہوں سے اُسے دیکھا اور پھر پتہ نہیں اس کے اندر سے اتنے
آنسو کیوں کر اُبل پڑے کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ہچکیاں لے لے کر۔
اُس کے ایک ہاتھ میں دہی ٹو کا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ کے حلقے میں
بچّہ جسے وہ سینے کے ساتھ بڑی مضبوطی سے چپکائے ہوئے تھا۔
اس نے اپنے آس پاس بہت سے لوگوں کی آوازیں سُنیں۔ اس نے
سر اٹھا کر دیکھا۔ بہت سے مکانوں کی چھتوں، دیواروں اور کھڑکیوں میں
سے لوگ چلاّ رہے تھے۔

"وہ رہا ——— وہ رہا!"

سپاہیوں نے بندوقیں تان لیں۔

"بچّے کو چھوڑ دو۔ بچّے سے الگ ہو جاؤ!!"

اب وہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ کسی کی جان نہیں لے سکتا تھا۔
اُس کے قریب صرف ایک ہی بچّہ تھا۔ جو اس کے فرقے کا نہیں تھا۔ ایک لمحے
کے لیے اس نے تیزی سے سوچا۔ بہت تیزی سے سوچا مرنے سے پہلے کس کا
سر پاش پاش کر دے ——— ؟

اس کی نظر اچانک ایک عورت پر پڑی۔ جو برآمدے میں دھوتی سے
اپنے جسم کو جلدی جلدی چھپاتی ہوئی روہانسی سی ہو کر کہہ رہی تھی ———

"اسے چھوڑ دیجیے۔ میرے بچے کو چھوڑ دیجیے۔"

اُس نے ہاتھ بھی جوڑ دیے۔ آسمان کی طرف اُنگلی اٹھا کر اس انجانی
قوت کا واسطہ دیا جو اس کا بھلا بھی کر سکتی تھی۔

اُس نے عورت پر سے نظریں ہٹا کر بچے کو دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف سہمی ہوئی غم ناک نظروں سے دیکھتے رہے۔ پھر اس نے بچّے کو آخری بار گلے لگایا۔ اس کے سر پر بوسہ دیا اور اسے اپنی ماں کی طرف جانے کے لیے چھوڑ دیا۔

بچہ بھاگ کر ماں کی طرف گیا۔ اس کی ماں بھی دوڑ کر اس کے پاس آئی اور لپک کر اسے اُٹھا لیا۔ یہ دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔ اپنی موت کو بھول کر مسکراتا رہا۔ اچانک ایک گولی سنسناتی ہوئی اس کی کنپٹی پر آ لگی۔ سُرخ سُرخ خون کا ایک فوارہ سا پھوٹ پڑا۔

اُس نے گرنے سے پہلے عورت اور اس کے بچّے کی طرف بڑی بے چارگی سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی رہیں۔

عورت بچّے کو سینے کے ساتھ چپکاتے ہوئے اس کے پاس آئی۔ بچہ اور عورت دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور حیرت بھی تھی۔ دیواریں پھاند پھاند کر آنے والے "مارو مارو!" کی چیخیں لگاتے ہوئے قریب آ رہے تھے۔

شیرازہ

نئی سڑک پر بنے ہوئے ایک مکان کے دروازے پر کیلے کے پتے اور رنگ برنگی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ اندر سے زور زور سے منتر اُچارن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ آواز کئی مختلف آوازوں کا مرکب تھی۔ لیکن معلوم ایک ہی شخص کی ہوتی تھی جو بہت ہی گمبھیر ہو، بہت ہی بوڑھا ہو، بہت ہی جذباتی بھی ہو!

جو ٹیکسی اس سہ منزلہ مکان کے سامنے آکر رُکی اس میں سے چار آدمی نکلے۔ ایک پینتالیس برس کا خوش پوش مرد، اس کی بیوی بھرے بھرے جسم کی اور اُن کے نوعمر بچّے —— لڑکا اور لڑکی —— وہ سب مکان کی دلکشی سے مسحور ہو کر رہ گئے۔ چند لمحوں تک سر اُٹھائے، کھڑے دیکھتے رہے۔

ان سے ذرا فاصلے پر چھوٹے چھوٹے کئی بچّے آئس کریم والے کو گھیرے کھڑے تھے۔ انھوں نے ان لوگوں کو دیکھا تو بھاگتے ہوئے آپہنچے ——

"انکل انکل!"

"آنٹی!"

"ہیلو بنٹی! ہیلو شوشو!"

مٹھو، کِکی، مِچی، گوگی، ڈمّو، بلّا، پولی، راجو اور ــــ نہ جانے کتنے سارے نام ایک ساتھ ہی اور ایک ایک کرکے بھی پکارے گئے۔ اور اسی وقت سیڑھیوں پر سے بھی دو اور بچّے کودتے ہوئے نیچے آئے۔ شور بڑھ گیا۔ شور سُن کر ہی اندر سے کچھ مرد اور عورتیں باہر نکل آئیں۔ انھیں دیکھ کر سب خوشی سے چلّا اُٹھے۔

"آپ لوگ کس گاڑی سے آئے؟"

"ہم تو مایوس ہو چکے تھے!"

"جب گاڑی کا وقت نکل گیا تو پتا جی بہت ناراض ہوئے پھر ــــ رونے بھی لگے۔"

"پتا جی کہاں ہیں؟"

"اندر ہَون کرا رہے ہیں۔"

"میں نے تار بھی تو دیا تھا! نہیں ملا؟ گاڑی چھوٹ گئی تو بڑی مشکل سے ایک پلین میں جگہ حاصل کرکے پہنچے۔ منوہر تم کب آئے؟"

"کل رات۔"

"اور تم بدن؟"

"آج ہی صبح جی ٹی سے۔ ناگ پور سے آتے ہوئے راستے میں اٹارسی جنکشن پر مجھے نند کمار بھی مل گیا چلیے چلیے، اندر چلیے۔ ہَون ہو رہا ہے۔ سب مہمان آ چکے ہیں۔"

چاروں بھائی ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ چوہدری صاحب

کا آہوتی والا ہاتھ رک گیا۔ انھوں نے چونک کر دیکھا۔ پھر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پروہت نے بھی منتروں کا اچارن روک لیا۔ ہون کنڈ کے آس پاس جتنے لوگ تھے وہ سب بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

دیر سے پہنچنے والے چوہدری صاحب کے سب سے بڑے پتر نے باپ کے چرن چھوئے۔ پھر اس نے ان سب لوگوں کو پرنام کیا جو اس کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ چند منٹ کے لیے جیسے سب کچھ رک سا گیا۔ لیکن پھر سب کچھ جاری بھی ہو گیا۔ ملی جلی آوازوں کا منتر اچارن، آہوتی اور کنڈ کے اندر چھوٹی چھوٹی، سوکھی اور خوشبودار لکڑیوں کی گھی اور سامگری کے ساتھ مل کر جلنے کی چڑ چڑ کی آواز۔

نت سوتر ورے نیم بھر گو دے دس دہی تھی

چوہدری نے اگنی کنڈ میں چمچہ بھر گھی ڈالا۔ اور پھر ایک ہاتھ کی پشت سے پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ کر اپنے بیٹوں کی طرف دیکھا جو ان کے سامنے ایک قطار میں سر جھکائے ہاتھوں میں سامگری اٹھائے بیٹھے تھے۔

پھر اچانک ہی چوہدری کے قریب ان کے دو پوتے آکر بیٹھ گئے۔ دادا نے انھیں شفقت سے اپنے گھٹنوں کے قریب کر لیا۔ چاہتے تھے سر جھکا کر باری باری سے دونوں کے سر کو چوم لیں۔ لیکن پروہت کی سواہا کی گرج نے انھیں چونکا دیا اور انھوں نے جلدی سے گھی سے لبالب بھرا ہوا چمچہ آگ میں گرا دیا۔

لوہے کا چھوٹا سا تپتا ہوا ہون کنڈ آگ کے شعلوں سے بھر گیا تھا۔ اب شعلے لوہے کی دیواروں سے ابھر ابھر کر اونچا اٹھنا چاہتے تھے۔

ایک گھنٹے کی مدت میں ہون کی سماپتی ہو سکی ۔ اس عرصے میں چودھری نے کئی بار بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔ لیکن اب ان کے چہرے پر ایک مسرت آمیز اطمینان کی جھلک تھی۔ وہ اپنی سفید گھنی مونچھوں کو ہاتھ کی پشت سے سہلاتے ہوئے ان لوگوں کی طرف بہت خوش ہو کر دیکھ رہے تھے جو مکان کی تعمیر پر پسندیدگی کا اظہار کر رہے تھے۔

ہون کے بعد بڑے کمرے میں چائے کا اہتمام تھا۔ سب مہمانوں کو وہیں لے جایا گیا۔ جو لوگ دیر سے پہنچے تھے وہ مکان کے ہر ایک کمرے میں جا کر اس کے در و دیوار کو دیکھ رہے تھے۔ موزیک کا فرش، بلجیم کے دھندلے شیشوں کی لمبی کھڑکیاں، شیشم کے جدید طرز کے دروازے، سیڑھیوں پر سفید سیمنٹ کی جالی کی اسکرین ـــــ ان لوگوں میں چودھری کا بڑا بیٹا بھی شامل تھا جس کے سامنے لوگ اس کے باپ کی ہمت اور محنت کی سراہنا کر رہے تھے۔ چودھری ان سب کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ سر جھکائے ہوئے۔ ایک ایک قدم بڑی احتیاط، فخر اور اطمینان سے اُٹھاتے ہوئے۔

ان کی بیوی ایک الگ کمرے میں اپنی بہوؤں اور لڑکیوں میں گھری بیٹھی تھی۔ اپنے ایک پوتے کو گود میں تھپکتی ہوئی سب پر بار بار یہ بات واضح کر رہی تھی کہ اتنا بڑا مکان چودھری صاحب کی تنہا کوششوں سے بنا ہے۔ جب ان کا ایک بھی بیٹا یہاں موجود نہیں تھا۔ سب کے سب گھر سے باہر تھے بھلائی۔ کلکتہ، بمبئی اور ناگ پور میں۔ انھوں نے باپ کو مدد کے لیے روپے بھیجے تھے لیکن چودھری صاحب نے سب کے روپے لوٹا دیے۔ وہ کسی سے ایک پیسے کی بھی مدد نہیں لینا چاہتے تھے۔ ان کے اپنے پاس جب کافی رقم موجود تھی تو وہ مدد کیوں لیتے؟ وہ صرف اتنا ہی چاہتے تھے کہ

اپنے بچوں کے لیے ایک بہت بڑا مکان بنوا سکیں ۔

جس وقت چوہدری بہوؤں اور بیٹیوں سے بھرے ہوئے کمرے میں پہنچے تو وہاں پاملا اور نیرا کی سگائی کی بات چل رہی تھی، یہ دونوں ہی ان کی پوتیاں تھیں۔ کل کی بچیاں بڑی ہو کر کالج اور یونی ورسٹی کی تعلیم بھی پوری کر چکی تھیں۔ انھوں نے کانوں میں پڑی اس آواز کو اَن سُنا نہیں کیا کہ پاملا کلکتے کے ہی ایک پروفیسر سے لو میرج کرنا چاہتی ہے۔ انھوں نے اپنی بڑی بہو کو غصّے بھرے لہجے میں پکارا۔

"شاردا، بچوں کی شادی بیاہ وہیں پر ہوگا جہاں ہم لوگ رہتے ہیں۔ دوسری جگہ کہیں بھی نہیں۔ دُکھ سُکھ آتے دیر نہیں لگتی۔ ایک دوسرے کے قریب رہنے سے بڑا سہارا ہو جاتا ہے۔" اس کے بعد ان کا غصّہ اُتر گیا۔ اسی فطری جذباتیت بھرے لہجے میں بولے "شاردا تم نے اپنا مکان دیکھا کہ نہیں؟"

انھوں نے اپنے بڑے بیٹے کو بھی بھرسے بُلایا، اور انھیں مکان کے اس حصّے میں لے گئے جہاں اُنھیں رہنا تھا۔ گھر کے سارے لوگ ان کے ساتھ پھر سے ہو لیے۔

"ہر ایک کے رہنے کے لیے تین کمرے، ڈائننگ روم، باتھ روم، کچن، اسٹور، اور آنے جانے کا راستہ تک الگ۔ ایک روز میں نے اسی کھڑکی میں سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ ایک مزدور کو بُلانا چاہتا تھا۔ سامنے کے حصّے پر نظر پڑ گئی جہاں مدن کو رہنا تھا۔ تو مجھے وہاں کی برساتی بے پردہ دکھائی دی۔ میں نے پوری دیوار ہی دو دو فٹ اوپر اٹھوا دی، کسی بہو کی بے پردگی کیوں ہو؟ ہر ایک کو اٹھنے بیٹھنے کی پوری آزادی ہونی چاہیے نا! کیوں؟"

یہ بتا کر وہ ہنس بھی پڑے۔ پھر پہلے کی مانند آبدیدہ بھی دکھائی دیے۔
چائے کے بعد سب مہمان رخصت ہو گئے۔ گھر میں صرف اپنے ہی
بچے بالے رہ گئے تو انھوں نے سب کو جمع کر کے وصیت نامہ نکالا،
چاروں بیٹوں کے ہاتھ میں ایک ایک نقل دے کر کہا ـــــ

"زندگی کا تو کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ اب تم لوگ جلدی سے یہاں آکر
بس جاؤ۔ میری آنکھوں کے سامنے۔ جس گھر کو بنوانے میں میں نے اپنی پوری
پونجی صرف کر دی ہے اس میں تم سب کو رہتے ہوئے بھی تو دیکھ لوں!"

بیٹے وصیت پڑھتے پڑھتے رک گئے۔ اپنے باپ کی طرف ہکّا بکّا ہو کر
دیکھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر سب سے بڑے نے کھنکار کر گلا صاف کیا
اور کہا:

"پتا جی آپ تو جانتے ہی ہیں کلکتے کی جس فرم میں ملازم ہوں وہ پرائیویٹ
ہے۔ اُسے چھوڑ کر یہاں آجاؤں گا تو پھر اتنی اچھی تنخواہ تو نہیں ملے گی اور وہ
سب سہولتیں بھی جو ہمیں وہاں رہنے سہنے کی اور بچوں کی تعلیم کی ملی ہوئی ہیں!"

چوہدری جی نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ مہندر کا مطلب یہ
نہیں ہو سکتا جو اس نے کہا ہے۔ لیکن پھر بھی انھوں نے پوچھا ـــ

"تیرے ریٹائر ہونے میں تو ابھی بیس برس ہوں گے۔"

"جی ہاں اتنے تو ضرور ہیں۔"

"تو تو سمجھتا ہے میں تب تک زندہ رہوں گا؟"

اس کے بعد انھوں نے مدن کی طرف دیکھا ـــــ

"مدن تو؟ تو تو آجائے گا نا!"

مدن ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ جس میں ملازمت کی ساری

بے بسی سمٹ آئی تھی۔ بولا۔ "ہماری کمپنی کی ملیں صرف چار جگہوں پر ہیں۔ بمبئی بنگلور، مدراس اور مدرائی۔ ادھر تو ایک بھی نہیں ہے۔"

چودھری صاحب کتنے لمحوں تک اس کی آنکھوں میں ڈوبے ہوئے سے دیکھتے رہے جیسے جاننا چاہتے ہوں کیا اس نے یہ سب کہہ کر اپنے باپ کے ساتھ انصاف کیا ہے؟

نند کمار نے باپ کے پوچھنے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ "میری قسمت تو بھلائی کے ساتھ ہی وابستہ ہو چکی ہے مجھے فولاد کے اس کارخانے کے علاوہ اور کہیں بھیجا ہی نہیں جا سکتا۔"

سب سے آخر میں جواب دینے کی باری منوہر کی تھی۔ وہ پچیس برس کا ایک مضبوط نوجوان تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر ابھی تک لڑکپن کی جھلک بھی تھی۔ جیسے زندگی کے کارزار میں اُسے قدم رکھے ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی ہو۔ اس نے پہلے تو ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر کہا۔ "میں نے سائنس کے جس سبجیکٹ میں ڈاکٹریٹ کی ہے اس کی مزید ریسیرچ میں ناگ پور میں رہ کر ہی کر سکتا ہوں۔ پتہ نہیں میں یہاں کبھی آ بھی سکوں گا کہ نہیں! ہو سکتا ہے ناگ پور میں رہتے رہتے وہیں پر ہی بس جاؤں!"

چودھری صاحب کو یوں لگا جیسے ان کی ساری محنت پر پانی پھر گیا ہو۔ وہ دیر تک کچھ بول ہی نہ سکے۔ ان کے لڑکے اپنے اپنے بیوی بچوں کو لے کر وہاں سے کھسک گئے۔ کسی کو سسرال جانا تھا۔ کسی کو اپنے دوستوں سے ملنے۔ کسی پر کوئی پکچر دیکھنے کی دُھن سوار تھی۔ چودھری صاحب اور ان کی بیوی وہاں اکیلے بیٹھے رہ گئے۔ اتنے بڑے مکان میں اکیلے ــــ!

ساحل

منوہر کے ہاتھ سے اس کے ایک ساتھی نے کتاب چھین کر سب کے سامنے کر دی ۔ کتاب سیکس کے متعلق تھی اور اتفاق سے اس کے اندر سے ایک تصویر بھی نکل کر گر پڑی جو اس کی بیوی کی تھی ۔ اس کے ساتھی تصویر دیکھ کر ہنسنے لگے ۔ ان کی ہنسی سے ساری آرام گاہ گونج اٹھی ۔ پھر اس ہنسی کا سلسلہ ان سب کی اپنی اپنی آپ بیتی کے ساتھ جا کر مل گیا ۔ اور وہ بڑی بے تکلفی سے ایک دوسرے کو اپنے معاشقے سنانے لگے ۔

منوہر ان سے اپنی کتاب اور کاجل کی تصویر چھین کر وہاں سے چلا آیا تھا ۔ اسے ڈی وَن اَپ مال گاڑی لے کر اپنے ہیڈ کوارٹر کو لوٹ آنا تھا ۔

سارے راستے میں اس کے کانوں میں ساتھیوں کی ہنسی اور باتیں گونجتی رہیں ۔ اس کی بیوی کا ذکر کر کر کے وہ اسے اکثر چڑاتے تھے لیکن وہ ان سب کو جاہل سمجھتا تھا ۔ اگر کاجل خوب صورت ہے ، ذہین ہے ، اور اس کے دل و دماغ اور خواہشات کا پورا ساتھ دیتی ہے تو وہ اسے

دل و جان سے کیوں نہ چاہے؟

منوہر کاجل کو ہر وقت اپنے قریب رکھتا تھا۔ ڈیوٹی کے اوقات کے علاوہ وہ جتنا وقت بچا سکتا اسے وہ کاجل کے ساتھ گزارتا۔ شادی کے بعد اس نے ایسے دوستوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا تک چھوڑ دیا تھا جو کبھی کبھی حد سے زیادہ بے تکلف ہو جاتے تھے۔ مزاج اور فطرت کے اعتبار سے وہ اپنے ساتھیوں سے مختلف ہی واقع ہوا تھا۔ پچھلے چھ سال میں کوشش کے باوجود خود کو ان جیسا نہیں بنا پایا تھا۔ لیکن اسے چوں کہ گھر سے دور کسی نہ کسی جنکشن کی آرام گاہ میں ان کے ساتھ آٹھ دس گھنٹے یا کبھی کبھی تو اس سے بھی زیادہ عرصہ گزارنا پڑ جاتا تھا اس لیے ان کی باتیں بھی سُننا ہی پڑتیں۔ لیکن خود کو ان سے الگ رکھنے کے لیے وہ کوئی نہ کوئی کتاب بھی اپنے ساتھ رکھے رہتا تھا۔ فلسفہ، ادب اور سیاست اس کے محبوب موضوعات تھے۔ بی، اے کرنے کے بعد اس قسم کے ماحول میں پھنس جانے پر اس نے وہاں سے نکلنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ یہی کتابیں ہی اب اس کے لیے فرار کا ذریعہ بنتی تھیں۔

مال گاڑی کا گارڈ ہونے کی حیثیت سے اُسے کئی کئی گھنٹے نگا ناراپنی بریک میں تنہا بیٹھے رہنا پڑتا۔ چھ برسوں میں وہ اپنے ڈویژن کے ہر ایک سیکشن میں سینکڑوں بار جا چکا تھا۔ اب بریک کی کھلی کھڑکی میں سے باہر جھانکتے رہنے میں اس کے لیے کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ ریلوے لائن کے دو رویہ بچھے ہوئے سارے کھیتوں، دیہات اور پیڑوں تک کو وہ پہچان گیا تھا بریک کے اندر کونے میں بنی ہوئی ایک سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی وہ سارا وقت پڑھنے میں گزار دیتا۔ بریک زور زور سے ہچکولے کھاتی تھی۔

ایسے ہچکولے کہ کبھی کبھی تو اس کا ہینڈ لیمپ بھی گر پڑتا اور تیل گر جانے سے لیمپ بھک بھک جلنے لگتا۔ وہ خود بھی بہت کوشش سے ہی متوازن ہو کر بیٹھ سکتا تھا اس وقت اس کے لیے اپنے سامنے رکھی ہوئی کتاب پڑھنا مشکل ہو جاتا۔ سطریں نظروں کے سامنے کودنے لگتیں۔ لیکن وہ ایسی کتابوں کا انتخاب زیادہ پسند کرتا جو موٹے ٹائپ میں چھپی ہوئی ہوں جن پر چلتی مال گاڑی کے ہچکولوں اور جھٹکوں کے باوجود نگاہیں جما کر رکھی جا سکیں۔ لیکن اب تو وہ ہچکولوں کا عادی ہو چکا تھا۔ انہی کے درمیان اپنا لکھنے کا سرکاری کام بھی کر لیا کرتا۔ ہچکولوں کو اپنی زندگی میں اس قدر رچا بسا لیا تھا کہ کبھی کبھی تو ان سے دور جا کر اسے اپنے گھر میں ٹھیک طرح سے نیند بھی نہیں آپاتی تھی یوں لگتا جیسے زندگی اپنے کسی معمول سے اچانک محروم ہو گئی ہو! اس نوکر کی طرح جو ایک دن کے ناغے کی وجہ سے بدمزاج مالک کی روزمرہ کی پھٹکار کی کمی محسوس کرتا ہو!

ایک دن اُسے نیند نہیں آ رہی تھی تو اس نے کاجل سے کہا تھا۔

"اگر اس وقت گاڑی چل رہی ہوتی تو میں بڑے اطمینان سے سو رہا ہوتا۔"

یہ سن کر کاجل ہنس پڑی تھی۔ اس کے پلنگ کا پایہ پکڑ کر کہنے لگی ——— "آپ سوئیے نا۔ میں رات بھر پلنگ کو جھٹکے دیتی رہوں گی!"

جب وہ ہیڈ کوارٹر پر پہنچا تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اس نے اسٹیشن کے بک اسٹال پر سے اخبار میں فلموں کے اشتہارات کا صفحہ دیکھا۔ جلدی سے سائیکل اُٹھائی۔ وہ کاجل کو ساتھ لے کر سوئنگ ٹوری ممبر، دیکھنے جائے گا آج آخری دن ہے۔ راستے میں وہ لائبریری کی کتاب بھی واپس کر سکے گا جو اس کے تھیلے میں پڑی ہے اچھی فلم کو سمجھنے اور اس کی

تعریف کرنے کی کاجل کے اندر بڑی صلاحیت ہے۔ وہ اپنے ساتھ صرف کاجل ہی کو لے جاتا ہے۔ اپنی کسی بہن کو ان کے ضد کرنے پر بھی نہیں لے جاتا۔

جب وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا تو اسے اندر سے اپنی ماں کی آواز سُنائی دی۔ وہ بہت اونچا بول رہی تھی۔ وہ یقیناً کاجل ہی کے ساتھ کسی وجہ سے جھگڑ رہی ہے! اس نے اندازہ لگایا ان کے گھر میں اکثر ایسا ہوا کرتا ہے۔ عام طور پر یہی ہوتا ہے۔ بیٹا اپنی من پسند لڑکی کے ساتھ شادی کر لیتا ہے اور اسے حد درجہ چاہتا ہے تو ماں باپ ان دونوں سے خفا رہنے لگتے ہیں۔ منوہر کے گھر میں بھی حسد اور بے چینی کی ایک فضا پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا زندگی میں یہ سب ہوا کرتا ہے۔ گھر میں کسی جھگڑے کو نپٹانے کے لیے سنجیدگی سے کام لیا جائے اور اس سے بھی جھگڑا بڑھ جائے تو وہ اس پر غور ہی کیوں کرے؟ وہ اپنے ایسے رویّے کی بنا پر ماں باپ کے علاوہ اپنی بہنوں کی ہمدردی سے بھی محروم ہو گیا۔ پھر بھی وہ مطمئن تھا۔ سوتے جاگتے کاجل کے خواب دیکھ دیکھ کر وہ اپنا من بہلائے رکھتا۔ کئی کئی روز کے بعد گھر لوٹتا تو اس کے اندر کاجل سے ملنے اور اس سے پیار کرنے کی ایک شدید خواہش اُبل رہی ہوتی۔ وہ راستے میں کسی کے پاس رُکنا بھی پسند نہ کرتا۔ کسی کے ساتھ بات کرنا تو در کنار۔

اس کی ماں چلاتی رہی۔ اس کا جی چاہا کوئی ایسا دروازہ بھی ہوتا جہاں سے ہو کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں کاجل کے پاس پہنچ جاتا۔ ماں کے لب ولہجے سے معلوم ہوتا تھا آنگن میں اس کا باپ اور بہنیں بھی موجود ہیں۔ دونوں بہنیں۔ کانتا اور مدھو۔ درشن جو دونوں بہنوں کے بیچ

یں کتنی کئی مہینے پہلے بیاہی جا چکی تھی۔ کاجل کے ساتھ جھگڑا ہو جاتے پر وہ ماں ہی کا ساتھ دیتی تھی۔ اب بھی جب وہ سسرال سے آتی ہے تو ماں کا ساتھ دیتی ہے۔ گھر کے روز روز کے جھگڑے سے تنگ آکر منوہر نے کئی بار چاہا کہ کاجل کو ساتھ لے کر کہیں اور چلا جائے۔ کسی اور مکان میں جا کر رہنے لگے۔ لیکن اس نے جب بھی ایسا کرنا چاہا اس کے ماں باپ ہی نے اور بہنوں نے رو رد کر دونوں کا راستہ روک روک لیا۔ ماں باپ انھیں اپنے سے الگ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

کتنی دیر تک دروازے پر کھڑے رہ کر اس نے آخر دروازہ کھٹکھٹا ہی دیا۔ چاہتا تھا دروازہ کھولنے کے لیے کاجل آئے۔ لیکن آئی اس کی ماں۔ ماں اسے دیکھتے ہی پلٹ گئی۔ اسی طرح بولتی ہوئی۔ لیکن منوہر اس کے چیخنے چلّانے کا کارن سمجھ کر حیران ہوا تھا۔ وہ آج کاجل پر نہیں بگڑ رہی ہے بلکہ درشن کی سسرال والوں کو بُرا بھلا کہہ رہی ہے جو وہاں سے دو سو میل دور بریلی میں رہتے ہیں۔ منوہر کو آنگن میں کاجل، پتا جی اور کانتا اور مدھو کے علاوہ درشن بھی دکھائی دی جو اپنے ٹرنک کے اوپر بیٹھی ہوئی تھی اُسے یہاں سے بریلی گئے ہوئے دو ہی دن ہوئے تھے وہ پھر لوٹ آئی ہے۔

وہ کسی کے پاس نہ رکا۔ دیوار کے ساتھ سائیکل ٹکائی اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کاجل اس کے پیچھے پیچھے گئی۔ کاجل کو دیکھتے ہی وہ مسکرا دیا۔ اسے گلے سے لگا کر بولا "جلدی سے تیار ہو جاؤ، کاجل، پکچر دیکھنے چلیں گے"۔

کاجل نے خود کو اس سے الگ کر لیا۔ بولی "معلوم ہے درشن کو سسرال والوں نے مارا ہے۔ بچاری روتی ہوئی گھر آئی ہے باہر جا کر

زرا اس سے بات تو کر لیجیے۔"

"کیوں؟ مارا کیوں گیا اُسے؟"

وہ ابھی تک کاجل کے جسم کو گھورے جا رہا تھا۔ کاجل کے دُھلے ہوئے بال اس کی پیٹھ پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اپنے بالوں کو جلدی جلدی سمیٹتی اور لپیٹتی ہوئی بولی۔

"بچاری کو سسرال میں ایک ساس سے نہیں تین تین ساسوں سے پالا پڑا ہے! نندیں بھی تو ساس سے کم نہیں ہوتیں! جن کی ہر بات گھر میں مانی جائے۔ وہی تو گھر میں راج کرتی ہیں! دیو ندر بچارا بھی ان کے سامنے دم نہیں مار سکتا۔"

"پھر؟ میں کیا کر سکتا ہوں اس معاملے میں؟ پتا جی خود ہی جانیں! انھوں نے خود ہی تو ایسا داماد پسند کیا تھا!"

اس کے منہ سے یہ بات زرا اونچی نکل گئی جسے سن کر باہر آنگن میں بیٹھے ہوئے اس کے پتا غصے سے کھول گئے۔ "نواب صاحب! زرا کمرے سے باہر آکر بات کر۔ اندر جورو کے پاس بیٹھا بیٹھا مجھ پر کیوں دوش دھر رہا ہے؟ میں نے تو جیسا ٹھیک سمجھا ویسا کر دیا۔ لیکن تو نے اس سے اچھا بر ڈھونڈنے میں میری کونسی مدد کر دی تھی؟ بول! کبھی بھولے سے بھی آکر پوچھ لیا تھا — لڑکا کیا کرتا ہے کچھ کھاتا کماتا بھی ہے یا نہیں؟"

منوہر کی ماں نے اسے بظاہر شانت کرانے کی کوشش کی: "اب چُپ ہو جائیے نا! زیادہ مت بولیے۔ آپ کی طبیعت پہلے ہی بہت خراب ہے! یاد نہیں، ڈاکٹر نے آپ کو غصہ کرنے اور اونچا بولنے سے منع کر رکھا ہے!"

"یہ نالائق بیٹا جب بات ہی غصہ دلانے والی کرے تو میں کیا کروں ؟"

"اس بچارے کو کیا معلوم ؟ یہ تو چار چار دن باہر رہتا ہے اس کا کوئی قصور نہیں ہے ۔"

ساس کے منہ سے یہ کلمے سن کر کاجل سکتے میں آ گئی اس کا مطلب یہ ہے ، وہی منوہر کو سکھایا پڑھایا کرتی ہے ! لیکن وہ ساس کا رویہ جانتی ہے وہ ہمیشہ ایسی ہی جلی کٹی سنایا کرتی ہے ۔ لیکن وہ کبھی شکایت نہیں کرتی ۔ بس رویا کرتی ہے ۔ اس وقت بھی اس نے آنکھوں میں آنسو بھر لیے اور پھر جلدی جلدی منوہر کے اُتارے ہوئے کپڑے سمیٹنے لگی ۔

منوہر کا باپ بیٹے کو خاموش پا کر بھی ٹھنڈا نہ ہوا ۔ اس کے کمرے کے سامنے جا کر بولا "تجھ سے تو اتنا بھی نہ ہوسکا کہ اپنی بہن کے سر پر ہاتھ پھیر دیا ہوتا ! بچاری سسرال سے کتنی دکھی ہو کر آئی ہے !! اس سے پوچھ تو لیا ہوتا تیرے ساتھ وہاں کیا بیتی ؟"

وہ باپ کے ساتھ کبھی نہیں اُلجھنا تھا ۔ کینسر کی بیماری نے انھیں کافی چڑچڑا بنا دیا تھا ۔ منوہر تولیہ اُٹھا کر غسل خانے میں چلا گیا ۔ وہاں سے لوٹا تو درشن کو سامنے کھڑا پایا ۔ وہ اوور کا نتال کر کوئلے کی بیٹی کو ایک دوسرے بکس کے اوپر رکھ رہی تھیں ۔ درشن خود ہی بولی " بھیا جی نمستے ۔"

اُس نے اُسے نمستے کا جواب دے دیا ۔ اور کچھ نہ کہا اور پھر اپنے کمرے میں چلا گیا ۔

منوہر کاجل کو ساتھ لے کر باہر جانے کے لیے آنگن میں سے گزرا تو گھر کے سب لوگ اُن کی طرف عجیب طنز بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اپنے

ہی گھر میں اس کی زندگی اجنبیوں کی سی تھی۔ اس کی سوچیں باقی گھر والوں سے بالکل مختلف تھیں۔ اس کے اپنے دو کمروں کی فضا تک باقی گھر سے مختلف تھی۔ وہ مختصر اور صاف ستھرے سامان کا دلدادہ تھا۔ اس کے ماں باپ اور بہنوں کے کمرے ٹرنکوں، چارپائیوں اور بستروں وغیرہ سے ٹھسا ٹھس بھرے پڑے رہتے تھے کمروں کی دیواریں بے شمار کلنڈروں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ جنھیں دیکھ دیکھ کر منوہر دل ہی دل میں کڑھتا تھا۔

وہ دونوں رات کو گیارہ بجے لوٹے۔ فلم دیکھنے کے بعد انھوں نے حضرت گنج میں کسی ہوٹل میں کھانا کھالیا تھا۔ اس کے بعد کچھ دیر تک گھومتے رہے تھے۔ گھر میں ابھی تک سب لوگ جاگ رہے تھے اس کے باپ کے کمرے میں روشنی تھی وہ صبح کا باسی اخبار پڑھ رہے تھے۔ مدھو بھی پڑھ رہی تھی۔ اس کا چند ماہ بعد انٹر فائنل تھا۔ اس کی ماں بستر میں کانتا کی دونوں بچیوں کو اپنے ساتھ لٹائے انھیں ایک کہانی گا گا کر سنا رہی تھی۔ آنگن میں چوکے کے اندر درشن اور کانتا دونوں بیٹھی کھانا پکا رہی تھیں ان کے قریب ہی ایک شخص بیٹھا تھا جس کی طرف منوہر نے حیران ہو کر دیکھا۔

وہ گوردیال تھا۔ کانتا کا شوہر۔ لیکن گوردیال نے منوہر اور کاجل کو دیکھ کر بھی انھیں نمستے نہیں کی۔ انھیں ایک نظر دیکھ کر پھر سر جھکا لیا۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا۔ کسی سے ملنے کے آداب اسے آتے ہی نہیں تھے۔ کوئی خود آگے بڑھ کر اس کی خیریت دریافت کرلیتا تو وہ ماتھے تک ہاتھ لے جاکر ایک بے بس سی مسکراہٹ دکھا دیتا۔ ورنہ وہ نظر انداز کیے جانے پر شکایت بھی نہیں کرتا تھا۔ اسے دیکھ کر منوہر کو غصہ آگیا۔ وہ اس سے کچھ کہے بغیر ہی اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کانتا پیدائشی طور پر کم عقل تھی۔ بہت کم بولتی تھی۔ اس کے لیے منوہر کے باپ نے جو داماد تلاش کیا تھا وہ بھی ویسا ہی نکلا۔ جس کی نہ کوئی شخصیت تھی نہ ہی کوئی کام کرنے کی صلاحیت۔ جب سے شادی کی تھی اس نے کئی دھندے کیے۔ اگر بتیاں بیچیں۔ دیسی صابن کی ایجنسی لی۔ جلد سازی بھی کی اور سائیکل مرمت بھی۔ لیکن وہ کہیں بھی کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ کانتا کو بھی وہ اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا۔ کانتا اسی گھر میں رہتی تھی۔ وہ سال ڈیڑھ سال کے بعد اچانک اس سے ملنے کے لیے آجاتا۔ اس نے آج تک کانتا کو دو بچیاں ہی دی تھیں۔ پیسہ یا کپڑا کبھی بھی نہیں۔

اب وہ پھر یہاں آنکلا ہے۔ دو چار دن رہ کر پھر غائب ہو جائے گا۔ جاتے جاتے ایک اور بیج ڈال جائے گا۔ منوہر کا جی چاہا گوردیال کو فوراً وہاں سے نکال دے۔ کاجل بھی اُسے دیکھ کر خوش نہیں ہوئی۔ وہ بھی چاہتی تھی گوردیال کو وہاں ٹھہرنے کا موقع نہ دیا جائے۔

اس کے پتا کینسر کے مریض تھے۔ ان کی موت سامنے کھڑی تھی۔ آپریشن سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا تھا۔ درشن اپنے سسرال میں خوش نہیں رہتی تھی وہ اس طرح پہلے بھی دو بار لڑ کر چلی آئی تھی۔ مدھو ستره برس کی ہو چکی تھی۔ ایسا لگتا تھا یہ سارا گھرانا ایک جہاز کی طرح طوفان میں گھرا ہوا ہے۔

منوہر نے کانتا کو اپنے کمرے میں بلا کر اُسے وہیں سونے کے لیے کہہ دیا۔ اپنے پلنگ کے پاس ہی دوسری چارپائی ڈال کر بستر بچھا رکھا تھا۔ کانتا اپنے بھائی کے سامنے کبھی زبان نہیں کھولتی تھی۔ وہ یوں بھی بہت کم ہی بولتی تھی۔ چُپ چاپ چارپائی پر لیٹ گئی۔ کاجل اور منوہر کچھ دیر تک کتابیں پڑھتے رہے۔ کاجل کو نیند آنے لگی تو وہ کتاب رکھ کر سو گئی۔ منوہر روشنی بجھا کر بھی جاگتا رہا۔

دراصل اس کی آنکھوں سے نیند اُڑ چکی تھی۔ وہ کئی روز کے بعد گھر لوٹا تھا۔ اس نے اپنی مسرت اور خواہش کو دبا لیا تھا۔ اس کے کانوں میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے گوردیال کے کھانسنے کی آواز آجاتی جو ایک الگ کمرے میں لیٹا ہوا کانتا کا انتظار کر رہا تھا اس کی کھانسی سُن کر کانتا بڑی بے چینی سے کروٹ بدل لیتی۔ لیکن اپنے بھائی کو جاگتا ہوا پاکر پھر دم سادھ لیتی تھی۔ منوہر گوردیال کی کھانسی سُنتے ہی ہولے سے خود بھی کھانس دیتا تھا۔

دو بجے تک گوردیال کی آہٹ سُنائی دیتی رہی۔ کھانسنے کے علاوہ وہ باہر نکل کر نل کے پاس بھی کئی مرتبہ گیا۔ کبھی پانی پیا کبھی پانی کو گرایا۔ منوہر کو اپنے دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگا۔ اتنا بڑا بوجھ کہ اس کے نیچے خود کو دبتا ہوا محسوس کیا۔ وہ کتنی دیر سے اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنے سر کو دبائے ہوئے لیٹا تھا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا سر ابھی پھٹ جائے گا۔ ایک عجیب سے احساس نے اسے افسردہ بنا دیا وہ لمحہ بہ لمحہ غمگین ہوتا گیا۔ اس کے ماں باپ کو معلوم نہیں تھا کہ اس نے کانتا اور گوردیال کو الگ کمرہ رکھا ہے۔ اُنھیں معلوم ہو گیا تو وہ بگڑیں گے۔ پھر چلّائیں گے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ چپکے چپکے رونے لگے۔ کاجل گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ وہ کانتا کو اپنے کمرے میں بلاکر اس طرح اطمینان سے سوگئی تھی جیسے اس کے خیال کے مطابق دوسرے بھی اسی اطمینان کے ساتھ سو چکے ہوں گے۔

اچانک منوہر نے کمرے کے اندر ایک پرچھائیں سی حرکت کرتی ہوئی دیکھی وہ کتنی دیر سے بے حس و حرکت پڑا تھا اسے سویا ہوا جان کر کانتا اپنی چارپائی سے اُٹھ پڑی تھی وہ بہت ہی محتاط قدم رکھتی ہوئی باہر جارہی تھی۔ وہ بہن کو باہر جانے سے کیسے روکے؟ اس نے کھانسنا چاہا لیکن اس کی آواز حلق میں ہی پھنس کر رہ

گئی۔ وہ کوئی آواز نہ نکال سکا۔ اس سے اُٹھ کر بیٹھ جانا بھی ممکن نہ ہو سکا۔ جیسے کسی نے اس کے بدن کی ساری شکتی کھینچ لی ہو۔ کانتا نے دبے پاؤں باہر جا کر دروازہ بند کر دیا۔ اس کے بعد گوردیال نے بھی کوئی آہٹ نہ کی۔ منوہر پہلے سے بھی کہیں زیادہ افسردہ ہو گیا کوشش کر کے اپنے بدن میں تھوڑی سی شکتی پیدا کی۔ صرف اتنی ہی شکتی کہ کروٹ لے کر ساتھ ملے ہوئے دوسرے پلنگ پر سرک کر پہنچ سکے۔ دوسرے پلنگ پر جا کر اس نے کاجل کی آغوش میں اپنا مُنہ چھپا لیا اور دھیرے دھیرے سسکنے لگا۔

یہ میرا گھر ہے

جاڑوں کی ایک سرد ترین رات ہے۔ ایودھیا کا ماگھ میلہ چند روز پہلے ختم ہوا ہے۔ میں وہاں سے بہت کچھ لے کر آئی ہوں۔ نئے پیسے۔ ٹکیاں، پانچ نئے پیسے ایک پوٹلی سی بن گئی ہے۔ اور ایک جوڑی ٹاپس بھی ملے ہیں۔ خالص سونے کے جنہیں دیکھتے ہی آنکھیں چندھیا جائیں۔ مجھے اس عورت کا چہرہ ابھی تک یاد ہے۔ میری نظروں کے سامنے کھڑا ہے۔ میرے پاس دیر تک کھڑی رہی۔ میری طرف دیکھتی تھی۔ لیکن جیسے کسی بہت بڑی اُلجھن میں ہو۔ پھر اچانک اس نے اپنے دونوں ٹاپس اُتار کر میری ہتھیلی پر رکھ دیئے اور سر جھکا کر ایک طرف کو چل دی۔ بھیڑ میں کھو گئی۔ میں اپنی مٹھی کو بند کیے حیران سی اس کے پیچھے پیچھے گئی۔ اُسے بہت ڈھونڈا لیکن وہ کہیں نہ ملی۔

میں پھر لکھنؤ میں ہوں۔ لکھنؤ کی گلیوں میں۔ بازاروں میں۔ ہر جگہ صبح سے شام تک۔ رات کو یہاں آجاتی ہوں۔ یہاں سبھی مانگنے والے آجاتے ہیں۔ لوگ یاترا کرنے جاتے ہیں تو بھکاریوں کو ضرور کچھ نہ کچھ دے دیتے ہیں۔

بہت سے لوگ اس میں وشواس رکھتے ہیں۔ ان کا ایسا وشواس نہ ہو تو ہم لوئی بھوک سے مر جائیں چھتے ہوئے لوہے کے لمبے پل کی سیڑھیوں پر دونوں طرف کتنے بھکاری دیوار سے لگ کر سو جاتے ہیں، یہیں لیٹ جاتے ہیں۔ نیند کسی کسی کو ہی آتی ہے۔ اتنی سخت سردی میں نیند کیسے آتی ہے۔ کسی کے پاس بھی لحاف یا کمبل نہیں ہے۔ پھٹی پرانی، میلی چکٹ چادریں ہیں۔ میری چادر میں کتنے ہی سوراخ ہیں۔ میں ان سوراخوں کے اندر سے جھانک سکتی ہوں۔

ایک چھوکرا میرے قریب سرکتا آرہا ہے۔ وہ میرے ساتھ لگ کر اپنا شریر سینکنا چاہتا ہے۔ "حرامی۔ پلا۔ دور ہٹ!"

میں اسے لات مار کر پرے ہٹا دیتی ہوں۔ اسی لمحے سیڑھیوں کے نیچے مسافر خانے کے برآمدے میں سے رکشے والوں کے ہنہنانے کی سی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے رکشے سیڑھیوں کے سامنے چھوڑ کر عورتیں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ وہ ہر روز رات کو یہی کرتے ہیں۔ جب کوئی گاڑی نہیں آتی ہے اور مسافر نہیں ہوتے تو وہ عورتیں تلاش کرنے کا شغل اختیار کر لیتے ہیں۔ انھوں نے مجھے کئی بار پکڑا ہے۔ میں ان میں سے ایک ایک کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ لیکن آج میں ان کے ہاتھ نہیں آؤں گی، وہ مجھے نہیں پا سکیں گے۔

میں جلدی سے اپنی چادر اور گدڑی سمیٹ کر چل پڑتی ہوں۔ پچکا ہوا میلا جست کا پیالہ اچانک کھسک کر گر جاتا ہے۔ کھن کھن بجتا ہوا آخری سیڑھی تک چلا جاتا ہے اور میں بھاگتی ہوئی اوپر کی سیڑھی تک پہنچ جاتی ہوں۔ آگے ایک لمبا راستہ ہے۔ ریلوے یارڈ کے اوپر پھیلا ہوا۔ لوہے کی چادروں سے ڈھکا ہوا۔ یہاں بھی دونوں طرف بھکاری سو رہے ہیں۔ میں جلدی جلدی آگے بڑھ رہی ہوں۔ یوں لگتا ہے سب بلائیں پیچھے رہ گئیں ہیں۔ لیکن مجھے کتنی سردی لگ رہی، کتنے زور کی

نیند آ رہی ہے۔

میں نے ہمیشہ ایک کمرے کی آرزو کی ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ خود کو سڑکوں پر ہاتھ پھیلائے، بھیک مانگتے پایا ہے۔ اُسی وقت سے میرے اندر اپنے ایک کمرے کی خواہش پیدا ہوئی ہے جس کے اندر داخل ہو کر اور اسے بند کر کے ہر مصیبت سے محفوظ ہو سکوں۔

میں پُل کے بیچ میں یارڈ کے اندر اُترنے والی سیڑھی کے سرے پر کھڑی ہوں۔ دور پورا شہر جگمگاتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ بجلی کے ہنڈوں کی قطاریں، لمبی لمبی جھوٹی جھوٹی جیسے وسیع اندھیرے کے سینے میں چلتی ہوئی، سنگین گڑی ہوں نیچے ـــــ پل کے نیچے دور تک، چاروں طرف مال گاڑیوں کے ڈبے ہی ڈبے ہیں۔ بے شمار پٹریوں کے اوپر کھلونوں کی مانند رکھے ہوئے ہیں۔ لال لال اور کالے کالے ڈبے۔ کچھ ڈبے رینگتے جا رہے ہیں۔ دور کہیں انجن کھنکھارتا، لمبے لمبے سانس لیتا ہوا ایک لمبی گاڑی کو کھینچے لیے جا رہا ہے۔ جیسے کوئی زخمی مریل بیل مال سے بھری ہوئی گاڑی کو گھسیٹتا ہے۔ میں اس تصور سے کانپ جاتی ہوں کہ میں بھی ایک گھسی پٹی بے کار سی گاڑی ہوں۔ اور ـ

نہیں میں ایک کمرے کی بابت سوچ رہی تھی۔ بند کمرے کے بارے میں جس کے اندر صرف میں رہ سکوں۔ میں۔

میں دھیرے دھیرے نیچے اُترنے لگتی ہوں۔ جی چاہتا ہے کسی گاڑی کے اندر چپکے سے لیٹ رہوں۔ گاڑی چلتی رہے، چلتی رہے۔ میں اطمینان ـــ سے آنکھیں بند کیے لیٹی رہوں۔ وہ ساری نیندیں پوری کر لوں جو آج تک میری آنکھوں میں لہراتی رہتی ہیں۔

دونوں طرف گاڑیوں کے سلسلے ہیں۔ میں اندھیرے میں دبے پاؤں چلی جا رہی ہوں۔ اونچے اونچے کھمبوں کی روشنی یہاں نہیں پہنچتی۔ گاڑیوں کے

سائے ایک دوسرے پر پڑ کر اور بھی گہرے ہو گئے ہیں۔ یہ خاموش اندھیرا سمندر کی طرح یا آسمان کی طرح وسیع نہیں ہے۔ ایک لمبی سمت کی طرح ہے، کم چوڑی سمت کی طرح۔

میں چلتے چلتے تھک گئی ہوں۔ کسی گاڑی کے دروازے تک میری بانہیں نہیں پہنچ سکی ہیں۔ مجھے یہ ڈر بھی ہے کوئی دیکھ نہ لے۔ میں ساری دنیا کی نظروں سے چھپ کر چل رہی ہوں۔

اچانک دور سے مجھے آگ کی لپٹ نظر آتی ۔ کہیں آگ جل رہی ہے۔ آگ کی روشنی میں تین چار آدمیوں کے سائے بھی دکھائی دینے لگتے ہیں، میرے پاؤں میں زنجیریں سی پڑ جاتی ہیں، میں کھڑی کھڑی رہ جاتی ہوں، پھر بیٹھ جاتی ہوں۔ کہاں جاؤں؟ وہ آدمی نہیں راکھشس ہوں گے۔ میں راکھشسوں کو خوب پہچانتی ہوں۔ اکیلی جگہ عورت کو پاکر ہر شخص راکھشس بن جاتا ہے۔ میں زمین پر بیٹھے بیٹھے گاڑیوں کے نیچے سے نکل جانے کے لیے راستہ دیکھ رہی ہوں ساری گاڑی ساکت ہے۔ خاموش جیسے میرے فیصلے کا انتظار کر رہی ہو۔ میں ان کے نیچے سے گزرتی ہوں کہ نہیں؟

میں راکھشسوں سے بچنے کے لیے ایک گاڑی کے نیچے گھس جاتی ہوں پھر ایک دوسری گاڑی کے نیچے سے، متوازی لیٹی ہوئی، پٹریوں پر سرکتی میں کئی گاڑیوں کے نیچے سے نکل آئی ہوں۔ جب اٹھ کر ارد گرد دیکھا تو یوں لگا ہے جیسے ساری دنیا کے آخری سرے پر پہنچ گئی ہوں۔ ایک لمبی دیوار، چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں گڑھوں میں بھرا ہوا پانی۔ دور اور اوپر سے آتی ہوئی ہلکی ہلکی روشنی۔ ایک پٹری پر ٹوٹی پھوٹی اوپر نیچی ہوئی گاڑیوں کا طویل سلسلہ ہے۔ یہاں صرف ایسی ہی ناکارہ گاڑیاں لگی ہوئی ہیں۔ کسی کی چھت غائب۔ کسی کی دیواریں۔ کسی کا ڈھانچہ ٹھنڈی ہوا سے

کانپتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ میں دھیرے دھیرے چلتی ہوئی آخری ڈبے تک پہنچ جاتی ہوں۔ آگے مٹی کا ایک اونچا ڈھیر ہے۔ اتنا مضبوط اور اونچا کہ اُسے توڑ کر گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ادھر بہت زور سے انجن ٹھوکر مارتا ہوگا تب بھی یہ ڈھیر ٹس سے مس نہیں ہوتا ہوگا۔

یہ ڈبہ آدھا راکھ سے بھرا ہوا ہے، میں فرش پر ہاتھ پھیر پھیر کر محسوس کرتی ہوں۔ آدھی چھت غائب ہے۔ دیواریں ایک طرف کو جھکی ہوئی ہیں۔ میں ایک پتھر پر چڑھ کر اندر جاتی ہوں، اِدھر اُدھر ٹہلتی ہوں۔ لگتا ہے یہاں کبھی کوئی نہیں آیا۔ کبھی کوئی نہیں آئے گا۔ دوسری طرف ایک اور گاڑی ہے۔ وہ بھی بے حس و حرکت ہے۔ ٹھنڈ سے جکڑی ہوئی سی۔

میں راکھ کے اوپر بیٹھ جاتی ہوں، پھر لیٹ جاتی ہوں۔ میں یہاں سو سکتی ہوں۔ صبح تک سو سکتی ہوں، یہاں مجھے کوئی نہیں جگائے گا۔ نرم نرم راکھ کی ٹھنڈک میرے جسم میں سرایت کر رہی ہے۔ میں ٹوٹی ہوئی چھت میں سے آسمان کو دیکھ رہی ہوں۔ مجھے یہ جگہ پسند ہے یہ خاموشی پسند ہے۔ یہ تنہائی پسند ہے۔ میں یہاں سے کبھی نہیں جاؤں گی، صبح جا کر رات کو پھر آجایا کروں گی۔ میں فرش کے ساتھ چمٹ سی جاتی ہوں۔ یہاں سے مجھے کوئی الگ نہیں کر سکتا۔ جی چاہا میں ایک بار چیخ کر سب کو بتا دوں یہ جگہ میری ہے۔ یہ جگہ میری ہے۔

دوسرے دن رات کو میں پھر وہاں جاتی ہوں۔ پھر وہیں جا سوتی ہوں۔ میں نے وہاں تک پہنچنے کا ایک اور راستہ تلاش کر لیا ہے۔ کبھی پیر کے مزار سے لوکو کے پل کی طرف ہو لیتی، وہاں سے واشنگ لائن ہو لیتی ہوں۔ واشنگ لائن کا آخری نل میرے ڈبے کے سامنے پڑتا ہے۔ لیکن اس نل کو اور کوئی نہیں استعمال کرتا وہ نل بھی میرا ہے۔ میرے گھر کے سامنے ہے۔ میں اس ڈبے کو گھر کہتے ہوئے کتنی

خوشی محسوس کرتی ہوں۔

اس ڈبے میں آج میری تیسری رات ہے۔ میں پچھلی دو راتوں کی طرح آج بھی بے انتہا خوش ہوں۔ میں اتنی خوش ہوں کہ مجھے بہت دیر تک نیند نہیں آتی۔ میں بہت دیر تک سوچتی رہتی ہوں۔ اس خیال سے میں بہت ہی محظوظ ہوتی ہوں کہ یہاں مجھ سے پہلے کوئی نہیں رہا ہوگا۔ یہاں لیٹ کر کسی نے میری طرح خواب نہیں دیکھے ہوں گے۔ میری طرح کوئی مسکرایا نہیں ہوگا۔

آج ہوا نہیں چل رہی ہے۔ موسم بدلا ہوا سا لگتا ہے۔ میں دروازہ کے سامنے گدڑی سر کے نیچے رکھے لیٹی ہوئی ہوں۔ کتنی دیر سے سر کھجا رہی ہوں۔ کتنے دنوں سے میں نہا نہیں سکی۔ میں آج تک کسی غسل خانے میں نہیں نہائی۔

مجھے کوئی گھسنے ہی نہیں دیتا۔ جب بھی موقع ملتا ہے کسی کھلے میدان میں نل کے نیچے کپڑوں سمیت بیٹھ جاتی ہوں۔ لوگ دیکھتے ہیں آوازیں کستے رہتے ہیں۔ میں نہانے میں لگی رہتی ہوں۔ ایسا کبھی کبھی ہی کر سکتی ہوں۔ جی چاہتا ہے اس تنہائی میں جی بھر کر نہاؤں۔ آس پاس کوئی نہیں، یہاں مجھے کوئی نہیں دیکھے گا میں کپڑے اُتار کر گھنٹوں پانی کے نیچے بیٹھ سکتی ہوں۔

میں اپنی خواہش کو دبا نہیں سکتی ہوں۔ پوٹلی میں سے ایک گھسی ہوئی صابن کی ٹکیہ نکال کر نل کے پاس چلی جاتی ہوں۔ میں نل کا پیچ کھولنا جانتی ہوں۔ پیچ کھولتے ہی فوارہ سا چھوٹ جاتا ہے۔ پانی اوپر کی طرف زور زور سے اُچھلنے لگتا ہے۔ جیسے آتش بازی کی چنگاری چھوٹتی ۔ میں کپڑے اُتار کر پانی میں گھس کر بیٹھ جاتی ہوں۔ پانی تازہ اور گرم ہے۔ میں بالوں کو کھول دیتی ہوں۔ میرے بال بہت لمبے نہیں ہیں۔ سوکھے رہنے کی وجہ سے بہت چھوٹے ہو گئے ہیں۔ میرے جسم میں بھی اب کشش نہیں رہی۔ لیکن اب چوں کہ پتلی اور لمبی ہوں، لوگ مجھے

اب بھی تاکتے ہیں۔ جسم کو مل مل کر دھوتے ہوئے ایسا لگ رہا ہے جیسے میلے غلیظ ہاتھوں کے نشان مٹا رہی ہوں۔ میرا جسم اب کتنا صاف ہے اور پاک ہو گیا ہے۔

اچانک میری نظر ایک مرد پر پڑ جاتی ہے۔ میں اسے دیکھتے ہی کانپ جاتی ہوں، کیوں کہ وہ کتنی دیر سے سامنے ایک ڈبّے کے دروازے میں بیٹھا ہوا مجھے گھور رہا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی سختی ہے، آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشت ہے، اس کے ہاتھ میں ایک مضبوط چھڑی ہے، میرے ساتھ آنکھیں چار ہوتے ہی وہ چلا اُٹھا۔

"بس نہا چکی؟ بس نا! اب بھاگ جا یہاں سے، نہیں تو جان سے مار ڈالوں گا۔"

اس کی آواز سن کر میں تھر تھر کانپنے لگتی ہوں۔ جلدی سے اس کے سامنے سے گزر کر اپنے کپڑوں تک پہنچتی ہوں، وہ مجھے برابر گھورتا رہتا ہے، چھڑی کو لوہے کی دیوار سے بجاتا رہتا ہے۔ میں جب کپڑے پہن چکتی ہوں اور بھیگے ہوئے بالوں کو ہاتھ میں لے کر نچوڑتی ہوں تو وہ میرے پاس آجاتا ہے۔ پوچھتا ہے "تو یہاں کیوں آئی۔ کیوں آئی۔ بول؟"

میں اپنے اندر شکتی جمع کر کے کہتی ہوں "یہ جگہ میری ہے۔ میں یہاں ہر وقت آسکتی ہوں، تو کون ہے پوچھنے والا؟"

وہ میرے جواب پر حیران سا رہ جاتا ہے۔ میری طرف دیکھتا رہ جاتا ہے۔ میں بھی اسے پہلی بار غور سے دیکھتی ہوں۔ یہ تو وہی دیوانہ ہے۔ دن بھر اسٹیشن پر گھومتا ہے۔ کبھی خالی متحرک گاڑیوں میں، اپنی چھڑی کو اس طرح ہلاتا ہوا شنٹ کراتا پھرتا ہے۔ کبھی کسی گیٹ پر ٹکٹ بابو کے پاس چپ چاپ مستعدی سے کھڑا ہوا، اس وقت کسی سے آنکھیں نہیں ملاتا، نیچے زمین پر تاکتا رہتا ہے۔

لوگ اُسے دیکھتے ہوئے گزرتے رہتے ہیں ۔ اسے میں پہچانتی ہوں لیکن یہ یہاں کیوں آیا ہے ۔

''یہاں میں رہتا ہوں سمجھی ؟ یہ جگہ میری ہے ۔ یہاں میرے سوا اور کوئی نہیں رہ سکتا ، تو بھاگ یہاں سے ، ابھی بھاگ !''

اسے سب گونگا سمجھتے ہیں ، وہ کسی کے ساتھ بات نہیں کرتا ۔

میری ہنسی نکل جاتی ہے '' میں یہاں سے نہیں جاؤں گی ، دیکھتی ہوں تو کیا کر لیتا ہے ''

یہ کہہ کر میں اپنے ڈبے میں جا بیٹھتی ہوں ۔ بہت دیر تک نہاتے رہنے کے بعد سردی سی لگ رہی ہے ، وہ میرے ڈبے کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے ۔ کچھ دیر تک سوچتا رہتا ہے ، پھر کہتا ہے '' تو ایسے نہیں مانے گی ''

یعنی وہ مجھے کوئی سزا دینا چاہتا ہے ۔ میں اس خوف کو محسوس کرتی ہوں لیکن وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ۔ اگر مار بھی ڈالے گا تو بھی میں یہاں سے نہیں ہٹوں گی ۔ میں اس جگہ سے کیوں ہٹوں جو میں نے خود تلاش کی ہے ۔ جسے میں نے پسند کیا ہے ۔ وہ مجھے یہاں سے بھاگ جانے پر مجبور نہیں کر سکتا ۔ وہ وقت گزر چکا ہے ۔ جب کسی مرد کو دیکھ کر بٹ ٹٹ بھاگ نکلتی تھی ۔ ڈر اور خوف کے کارن عورتوں کو بھاگنا ہی پڑ جاتا ہے ۔ بھاگتے بھاگتے منہ بھی خشک ہو جاتا ہے اور ٹانگیں بھی ٹوٹنے لگتی ہیں لیکن اس سے حاصل ہی کیا ہوتا ہے ۔ مرد کے ہاتھ تو پھر بھی جسم تک آ ہی پہنچتے ہیں ۔ کانوں کے بالکل قریب اس کا قہقہہ ، اس کی مضبوط گہری آواز ۔ اور جب کوئی پکڑ لیتا ہے تو ہوتا ہی کیا ہے ؟ جیسے ا[illegible] ہے تو چھن جاتا ہے ۔ بس ایک لمحہ ہی تو ۔ جو لوگ خود کو بے عزت سمجھنے لگتے ہیں ۔ بے وقوف ہیں ۔ مجھے جب بھی کسی نے پکڑ لیا ہے ۔ اس پر

رحم ہی آیا ہے۔ اس کی عقل پر افسوس ہی ہوا ہے۔ اس نے جب بھی میرے اندر کی کوئی چیز حاصل کرنے کی کوشش کی وہ اسے کبھی نہیں مل سکی۔ وہ میرا دل کبھی نہیں لے سکا۔ میرا دل اس کی زبردستی سے ہمیشہ آزاد رہا ہے۔

اس لیے میں اس کے سامنے اپنے ڈبے میں جم کر بیٹھی ہوں۔ وہ میری طرف اس طرح دیکھ رہا ہے۔ جیسے میں نے خود کو اس کے سامنے پیش کر رکھا ہے۔ لیکن وہ مجھے کسی قابل ہی نہیں سمجھتا۔ میں اب خوف زدہ نہیں ہوں، صرف حیرانی اور صدمے سے دو چار ہوں۔ کیوں کہ پچھلے دو دن سے میں خود کو وہاں تنہا سمجھتی رہی ہوں۔

"گھبراؤ مت، میں تجھے ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ مجھے آج تک کوئی عورت اس بات کے لیے مجبور نہیں کر سکی ہے۔ تو بھی ایسا نہیں کر سکتی، لیکن تجھے یہاں سے جانا ہی پڑے گا۔"

میں ٹپکتے ہوئے بالوں کو نچوڑنے لگتی ہوں۔ میں یہ جگہ کیسے چھوڑ سکتی ہوں جسے میں نے اس قدر پسند کیا ہے۔ میں کہتی ہوں "یہ جگہ میری ہے تو کیوں نہیں دفع ہو جاتا۔"

وہ اچھل کر اندر آجاتا ہے۔ مجھے بازو سے پکڑ لیتا ہے۔ میری گٹھری چھین کر باہر پھینک دیتا ہے۔ اور مجھے گھسیٹتا ہوا دروازے تک لے آتا ہے۔

"میں برسوں سے یہاں رہتا ہوں۔ یہ ساری لائن میری ہے۔ یہ سب گاڑیاں۔ میں ان سب کا مالک ہوں۔ چاہے کسی سے پوچھ لے اب بھاگ جلدی سے۔"

میں کئی روز سے یہاں رہ رہی ہوں۔ میں نے تیری منحوس صورت آج ہی دیکھی ہے۔ میں نے اپنے ڈبے کو صاف کر کے رہنے کے قابل بنایا ہے۔

اب اسے کبھی نہیں چھوڑوں گی۔"

اچھی بات! تو یہاں رہ کر تو دیکھ! وہ میرا بازو چھوڑ دیتا ہے۔ میں گرتے گرتے بچتی ہوں۔ وہ میری گٹھری اٹھا لیتا ہے۔ معاً مجھے خیال آتا ہے گٹھری میں تو میری نقدی ہے، سونے کے ٹاپس ہیں۔ انھیں لے کر بھاگ نہیں سکتا۔ میں کود کر اس کے پاس جاتی ہوں۔ اور گٹھری چھین لیتی ہوں۔ وہ مجھے گھورنے لگتا ہے۔

میں سوچتی ہوں اُسے کچھ دے کر دفع کیوں نہ کر دوں، یہ چلا ہی جائے تو اچھا ہے، ورنہ کتنی اچھی پرسکون جگہ چھن جائے گی۔

"لے دیکھ! میں تجھے کچھ دیتی ہوں، دیکھ رہا ہے؟" میرے ہاتھ میں وہی سونے کے ٹاپس ہیں۔ میں اس جگہ کے لیے سب کچھ دے سکتی ہوں، انھیں رکھ کر میں کیا کروں گی؟"

وہ بڑی حیرانی سے دیکھنے لگتا ہے، میں اُسے دور سے ٹاپس دکھاتی ہوں اور پھر اس کے سامنے زرا فاصلے پر پھینکتی ہوئی کہتی ہوں "پھر یہاں مت آنا۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے، سمجھا!"

میرا دل اچھل کر جانے کہاں پھنس کر رہ جاتا ہے! ٹاپس لائن کے پار گر جاتے ہیں اور اچانک ایک گاڑی اُدھر سے گزرنے لگتی ہے۔ لیکن وہ کود کر گاڑی سے چپک جاتا ہے۔ کہیں دو ڈبوں کے درمیان اور پھر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ میں نے اس کی لٹکتی ہوئی ٹانگیں دیکھ لی ہیں۔ وہ ضرور کٹ مرے گا۔ پگلا تو ہے ہی۔ لیکن پھر میں اطمینان سے اپنے ڈبے میں واپس آجاتی ہوں۔ رات بھر سوتی رہتی ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ کٹ مرا ہوگا۔ کہیں بہت دور جا کر۔ میں اس کی کوئی کھوج نہیں کروں گی۔

دوسرے دن میں بڑے اطمینان سے سو رہی ہوں۔ اچانک مجھے اس کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ میں اس کی چاپ پہچان لیتی ہوں وہ وہی ہے ــــ پگلا ــــ مجھے اس کے زندہ رہ جانے کی رتی بھر امید نہیں تھی۔ پھر بھی میں بازار سے چوہے مارنے کا زہر لے آئی ہوں۔ یہ زہر میں کسی کو بھی کھلا سکتی ہوں۔ جو بھی میرے راستے میں آئے گا، میری جگہ پر قابض ہونے کی کوشش کرے گا ــــ لیکن میں قاتل نہیں ہوں۔ قاتلوں کے چہرے بہت مزنیہ دیکھے ہیں۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ کوئی میرے اس تنہا کونے کو نہ چھینے۔

وہ دروازے میں سے جھانکتا ہے۔ وہی ہے بالکل۔ ٹھنڈے نیلے کوٹ میں۔ سفید میلی مرجھائی ہوئی پتلون میں۔ ہاتھ میں حسب معمول ڈنڈا لیے۔ کہتے ہیں۔ اس کی بیوی نے اس کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ اسے کسی دوسرے اسٹیشن پر بھیج دیا گیا تھا۔ وہ وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنے افسروں کی بہت منّت وسماجت کی تھی۔ دوسری جگہ جاکر اسے نئے سرے سے ایک گھر بنانا پڑتا تھا۔ اُسے وہاں کوئی مکان نہیں دیا گیا اور بھیج دیا گیا۔ وہاں وہ اکیلا ہی گیا اور جب کچھ عرصے بعد چھٹی لے کر لوٹا تو اس کی بیوی اس کو چھوڑ کر جاچکی تھی۔ اسی دن سے اس کا دماغ چل گیا ہے۔ پتہ نہیں یہ سچ ہے یا جھوٹ۔ لوگ یہی کہتے ہیں۔

"دیکھ، میں تجھ سے کچھ پوچھتا ہوں۔ سچ سچ بتائے گی نا!" وہ پیروں کے بل بیٹھ کر مجھے دھمکانے لگا۔ وہ مجھ سے جب بھی مخاطب ہوتا ہے اس کا لہجہ بہت ہی سخت ہوتا ہے، بالکل حاکمانہ۔ جیسے میں اس کی زرخرید ہوں۔

"بول، کیا کہنا چاہتا ہے؟" میں اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتی ہوں۔ اس پگلے کو تو میں مار مار کر یہاں سے بھگا دوں گی۔

وہ میرے سامنے مٹھی کھول کر کہتا ہے۔ "یہ ٹاپس تجھے کہاں سے ملے تھے؟"

میں حیران رہ جاتی ہوں۔ اس نے کل رات ٹاپس ڈھونڈ لیے تھے۔ وہ انہی ٹاپسوں کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ جو میں نے اُسے یہاں سے بھگا دینے کے لیے پھینک دیے تھے، اس کے چہرے پر بڑی سنجیدگی ہے۔ بڑی نرمی ہے، بڑی اذیت ہے۔ سختی کہیں بھی نہیں۔ میں خاموش رہتی ہوں۔ وہ کانپتے ہوئے لہجے میں پھر پوچھتا ہے: "مریادا تجھے کہاں ملی تھی؟ تو نے اسے دیکھا تھا نا!"

مجھے اس عورت کا چہرہ یاد آجاتا ہے۔ اس کی گھبراہٹ یاد آجاتی ہے۔

"بتا نا! —— تجھے کہاں ملی تھی؟" وہ میرے کندھے کو جھٹکنا چاہتا ہے۔

"مجھے نہیں معلوم۔" میں اس کا ہاتھ پرے ہٹا دیتی ہوں۔ وہ مجھے چپ چاپ گھورنے لگتا ہے۔ کچھ لمحوں تک انتظار کرتا ہے، پھر اس کے چہرے سے نرمی اور سنجیدگی غائب ہونے لگتی ہے۔ وہ کسی اندرونی غصّے کی وجہ سے تن کر کھڑا ہو گیا ہے، اس کے جس ہاتھ میں ڈنڈا ہے اسے لہرا کر پوچھتا ہے۔

"بتائے گی یا نہیں؟"

"میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں، یہ جگہ مجھے چھوڑنی ہی پڑے گی۔ لیکن نہیں چھوڑوں گی، کبھی نہیں چھوڑوں گی چاہے وہ میری جان ہی لے لے۔

وہ میرے جسم پر کئی وار کرتا ہے، کئی بار میری جان نکلتے نکلتے رہ جاتی ہے۔ وہ مارتے مارتے تھک جاتا ہے۔ ہاتھ روک کر ہانپنے لگتا ہے۔

پھر کوٹ کی آستین سے منہ پونچھتا ہوا باہر چلا جاتا ہے۔ میں راکھ سے بھری ہوئی گاڑی کے اندر اوندھے منہ پڑی سسکتی رہتی ہوں۔ روتے روتے جانے کتنی دیر ہو جاتی ہے، شاید رات گزر جاتی ہے۔ لیکن صبح ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔ روتے روتے میری آنکھ لگ گئی تھی۔ میں یقیناً سو گئی تھی۔ لیکن اب پھر میری نیند کھل گئی ہے۔ مجھے بدن کے جوڑ جوڑ دکھنے کا پھر احساس ہو رہا ہے۔ اچانک ڈبے کے دروازے پر کھٹکا سا ہوتا ہے۔ میں سر اٹھا کر دیکھنے لگتی ہوں۔ وہ پگلا پھر نمودار ہو جاتا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں مٹی کے پیالے ہیں۔

"لے، لے۔ زرا چائے تھام تو۔"

میں گرم گرم پیالے تھام لیتی ہوں۔ "بہت دور سے لا رہا ہوں۔"

وہ بے وقوفوں کی طرح ہنسنے لگتا ہے۔ لیکن وہ اندر آنے کی بجائے پیچھے پلٹ کر جاتا ہے۔

"میرا ڈنڈا گر گیا ہے۔ ڈنڈا لے آؤں۔"

میں راکھ کے اندر دونوں پیالوں کو جما دیتی ہوں۔ اور جلدی جلدی زہر کی پڑیا تلاش کرتی ہوں۔ "آج اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

میں زہر ہاتھ میں لیے بیٹھی رہتی ہوں، سوچتی ہوں۔ وہ خالی گاڑیوں کے ساتھ ڈنڈا بجاتے ہوئے اندر آجاتا ہے۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر زور سے "ہم" کہتا ہے پھر ہاتھ بڑھا کر پوچھتا ہے۔ "میری چار کہاں ہے؟ لا۔"

میں اس کے ہاتھ میں چار بھی دے دیتی ہوں اور پڑیا بھی۔

"یہ کیا ہے؟" وہ پڑیا ٹٹول کر پوچھتا ہے۔

"زہر" میں بڑے اطمینان سے جواب دیتی ہوں۔

"زہر؟"

"ہاں، ہاں زہر۔"

"کیوں؟ کس لیے؟"

"تیرے مارنے کے لیے تاکہ تو مجھ سے یہ جگہ نہ چھین سکے۔"

وہ ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ کتنی دیر تک خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ پھر پیالہ منہ کی جانب لے جاتے ہوئے ایک مصنوعی ضبط کے ساتھ کہتا ہے۔

"تو نے یہ کیوں نہ سوچا، میں بھی تو تیری چائے میں زہر ملا کر لا سکتا تھا۔"

یہ سن کر میں بھی سکتے میں آ جاتی ہوں۔ کتنی دیر تک صبح کے دھندلکے میں اس کی طرف گھورتی رہتی ہوں۔ پھر مسکرا کر گھونٹ گھونٹ چائے پینے لگتی ہوں۔

بے سر کا گوتم

پیرو درشنی بھون کے دروازے پر مجھے ایک دوست نے بتایا ــــ "تم بیلا پردہت کی تلاش میں تھے نا! وہ رہی ــــ بیلا پردہت ۔ وہ جو گنگولی کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی ہے۔"

اس نے یہ بھی بتا دیا ــــ "ان دونوں کی بڑی گہری انٹی میسی ہے ۔ چلو دونوں سے ملا دوں تمہیں۔"

ہمیں اپنی طرف آتا دیکھ کر دونوں چونک پڑے ۔

"بیلا جی، یہ ہمارے آرٹ کرٹک ہیں ۔ ترون بھارتی ۔ آپ کو کھوجتے پھرتے تھے۔"

بیلا پردہت نے ہاتھ جوڑ کر میرا سواگت کیا اور اپنے ساتھی کا تعارف کراتے ہوئے بولی ــــ "یہ ــــ مسٹر گنگولی، ہمارے نئے سرئیلسٹ پینٹر، پورا یورپ گھوم کر آ رہے ہیں!"

اپنی تعریف سنتے وقت گنگولی نے اپنی نظریں ایک کھمبے کی چوٹی پر

ٹکا دی تھیں لیکن اس کی مسکراہٹ بھینچے ہوئے ہونٹوں کے کونوں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ میں نے بیلا پروہت سے کہا —— "میں نے آپ کی بنائی ہوئی مورتیاں دیکھی ہیں۔ تین روز سے برابر نمائش دیکھنے آ رہا ہوں۔ لیکن آپ سے ملاقات ہی نہ ہو سکی۔"

"کیا سچ آپ تین روز سے آ رہے ہیں!" وہ ایک عجیب سی مسرت سے سرشار ہو کر بھی مجسم معذرت دکھائی دی۔ بے بسی کی ایک دل کش مورتی۔ بولی —— "ادھر ایسا ہوا کہ مجھے روزانہ دو گھنٹے کے لیے یہاں سے ایک اور ایگزیبیشن میں گائیڈ کی ڈیوٹی دینے جانا پڑا۔ یونٹی ہال میں دو فرنچ آرٹسٹوں نے بھی اپنی پینٹنگز لگا رکھی ہیں۔ آپ نے دیکھیں؟"

"جی ہاں دیکھی ہیں۔ لیکن میں تو آپ کی مورتیوں کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی فرمایئے۔" وہ چہرے پر ایک دل فریب مسکراہٹ لے آئی۔

"آپ نیوڈز کیوں بنایا کرتی ہیں؟"

"نیوڈز کیوں بنایا کرتی ہوں؟" وہ چونک سی اٹھی۔ کچھ سوچتی ہوئی سی بولی —— "خوب صورتی کو ہی پیش کرنے کے لیے، تو!"

"خوب صورتی کیا صرف ننگے جسم میں ہی ملتی ہے؟ اور وہ بھی صرف عورت کے!"

بیلا نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن مجھ پر بڑی طنز بھری نظر ڈال کر پھر اپنے ساتھی کی طرف مسکرا کر دیکھنے لگی۔

میں نے اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا —— "عورت کی سُندرتا کو تو ہمارے کویوں، لیکھکوں، چترکاروں، فوٹوگرافروں اور مورتی

کاروں نے ہر زاویے سے دیکھا اور پیش کیا ہے۔ میں اُن انٹلکچوئل لوگوں کی بات کر رہا ہوں جو اتفاق سے مرد ہیں۔ اپنی دنیا میں مردوں نے سُندرتا کی پیاس بجھانے کے لیے عورت ہی کو سمبل بنائے رکھا ہے۔ لیکن جب کوئی عورت قلم یا برش یا اپنی اُنگلیوں کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنائے اور وہ بھی عورت ہی کو خوب صورتی کا سمبل بنائے تو تعجب کی بات ہوئی نا! مرد کی فکر میں اُسے دل کشی کیوں نہیں نظر آتی؟"

گنگولی میری بات سُن کر زور سے ہنس پڑا تو میں نے پہلی بار اس کے لمبے لمبے دانت دیکھے۔ لیکن وہ پھر فوراً ہی اپنے عجیب انداز سے فرنچ کٹ داڑھی کو اوپر اُٹھا کر بیلا کو گھورنے لگا۔ یہ دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔ بیلا سے کہا ــــ "آخر عورتیں مرد کو ایک دل کش جانور ہی سمجھ کر اُسے ماڈل کیوں نہیں بنائیں؟"

بیلا مُسکرا دی۔ بولی ــــ "مرد طاقت کا سمبل ہے۔ خوب صورتی کا سمبل صرف عورت ہی رہے گی۔"

میں نے جواب دیا "چلیے آپ کی بات مان لیتا ہوں لیکن عورت کیا مرد کی طاقت سے متاثر نہیں ہوتی؟ آپ کی بنائی ہوئی مورتیوں ــــ 'بالکہ'، 'مامتا'، 'آنگن'، 'اے کس'، 'سٹی ڈویلرز'، 'نراشا'، 'بغاوت'، 'انتظار' وغیرہ میں سے ایک بھی مورتی مرد کی نہیں ہے۔ جو آرٹسٹ مرد ہیں وہ تو عورتوں کی مورتیاں بناتے ہی ہیں۔ لیکن اگر عورتیں بھی عورتوں کی مورتیاں بنانے لگیں تو یہ تو مردوں کے ساتھ بڑی بے انصافی ہوگی۔!"

گنگولی اُسے بات چیت ختم کر کے کہیں چلنے کے لیے اشارے کر رہا تھا۔ اُس نے بھی گھڑی دیکھ کر کہا ــــ "معاف کیجیے گا۔ ہمارا ایک جگہ

اپوائنٹ منٹ ہے۔ آپ پھر کسی سمے ملیے تو ذرا اطمینان سے باتیں ہوں گی۔ ویسے میں کل چار سے آٹھ تک پردرشنی میں ہی رہوں گی۔"

میں نے دوسرے دن ملنے کا وقت طے کرلیا۔ گنگولی میرے ساتھ ہاتھ ملائے بغیر ہی اس کے بازو میں بازو ڈال کر اُسے لیے ہوئے چلا گیا۔

بیلا پروہت جسمانی ساخت کے اعتبار سے کچھ ٹھگنی ہی تھی۔ لیکن رنگ روپ، دل کش مسکراہٹ اور باب بالوں کی وجہ سے بڑی کشش رکھتی تھی۔

دوسرے دن مجھے کہیں اور جانا پڑ گیا۔ میں نے فون پر اس سے معذرت کرلی۔ اس سے اگلے روز وہ اودے پور واپس جا رہی تھی۔ لکھنؤ کے لوکل اخباروں میں میں نے اس پر آرٹیکل دیکھے تھے۔ اس کے آرٹ کے متعلق دوسرے نقادوں کی رائیں بھی پڑھی تھیں۔ اس کے کام کی بہت زیادہ سراہنا نہیں ہوئی تھی کسی کسی نے تو اس کے آرٹ کو خالص کمرشل قرار دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ابھی اس میں ایک پختہ کلاکار کی جھلک نہیں ملتی تھی۔ نہ ہی اس کے اندر کسی وژن کا پتہ ملتا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں میں نے سمجھ لیا تھا کہ اسے اپنے پستہ قد ہونے کا شدید احساس ہے۔ جسمانی کشش سے محرومی کے اسی احساس نے اس کے ہاتھوں سے ایسی عورتوں کے مجسمے بنوائے ہیں جو اس سے زیادہ خوب صورت ہیں۔

جس روز وہ لکھنؤ سے روانہ ہوئی اسی روز اس کی مورتی کلا کے بارے میں میرا ایک بیان اخبار میں شائع ہوا جو اس نے پڑھ لیا تھا۔ جب میں اسٹیشن پر سی آف کرنے گیا تو اس نے میری رائے کا شکریہ ادا کیا۔ مجھے آئندہ ماہ نینی تال آنے کی دعوت بھی دی جہاں وہ اب اپنی پینٹنگز کی نمائش کرنے والی تھی۔

اس نے میرے ساتھ پورے اعتماد کے ساتھ باتیں کیں۔ ایسے اعتماد کے ساتھ جو صرف اندرونی اظہار کی قوت سے ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کے توجہ دیے جانے کی بنا پر بھی بنتا اور مضبوط ہوتا ہے۔ اس وقت وہ اپنے مدّاحوں کے درمیان گھری ہوئی کھڑی تھی۔ جن میں زیادہ تر آرٹ کالج کی لڑکیاں اور لڑکے تھے۔ وہ اس کے منہ سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ پر خوشی دکھانے لگتے۔ دو ایک نے میری رائے پر شدید نکتہ چینی بھی کر دی۔ جو کچھ میں نے لکھا تھا اُس سے وہ لوگ متفق نہیں تھے۔ میں نے انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن یہ سب بے سود ثابت ہوا۔ وہ تو بس بیلا پروہت کی خوشنودی چاہتے تھے۔ بیلا نے بھی اُن کے بچکانہ خیالات کی مخالفت نہ کی۔ اگر اُس نے ایسا کیا ہوتا تو میں خود کو وہاں تنہا محسوس نہ کرتا۔ مجھے اس کے ساتھ کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن جب میں نے تنہا رہ جانے کی بات کی ہی ہے تو یہ بھی بتا دوں کہ آرٹسٹ لوگوں نے مجھے ہمیشہ سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔ مجھے اس بات کا غرور نہیں ہے فخر ہے کہ میرے خیالات کی قدر کی جاتی ہے۔

نینی تال میں بیلا پروہت سے میری ملاقات کلب ہاؤس میں ہوئی۔ ہال کے اندر جگہ جگہ پتھر اور درختوں کے تنے رکھوا کر ان پر پینٹنگز سجائی گئی تھیں۔ کہیں کہیں بانس کی کھپچیوں پر بھی ٹکائی گئی تھیں۔ ایک تصویر تو لیمپ پوسٹ کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اُن پر بڑے اچھے ڈھنگ سے برقی لیمپوں کی روشنیاں پھینکی گئی تھیں۔ لگتا تھا ساری ہی پینٹنگز ایک کھلے باغ میں رکھی ہوئی ہیں۔ روشنیوں اور اندھیرے کے آرٹسٹک و دل کش امتزاج نے ہی ایسی فضا بنا دی تھی۔

نمائش کا افتتاح ایک ڈپٹی منسٹر سے کرایا گیا جو اس پردرشنی کا کلنک

ثابت ہوا۔ کیوں کہ ڈپٹی منسٹر کی تقریب میں آرٹ کا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ دیر سے آیا اور اس نے فوراً ہی واپس چلے جانے کی خواہش بھی ظاہر کی۔ اس لیے اس نے فوراً ہی روشنی کر کے نمائش کا افتتاح کر دیا۔ سرکاری کیمرہ مین اور افسر اور وہ تمام نک چڑھے جو منسٹروں کے آگے پیچھے نظر آنے میں ہی اپنی اہمیت سمجھتے ہیں وہاں کچھ دیر تک خاصے اہم بنے رہے۔ جب وہ سب چلے گئے تو میں نے بیلا کو تلاش کیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ بھی مایوس دکھائی دی۔

بولی ـــــ "بہتر ہوتا اگر میں نے کسی آرٹسٹ یا آلوچک کو ہی ان آگوریشن کے لیے بلوایا ہوتا!"

میں نے کہا ـــــ "چلیے، آپ کی پینٹنگز کا ایک راؤنڈ ہو جائے۔"

'گریف'۔ 'بپتا'، 'پورٹریٹ'۔ 'سیلاب'۔ 'اکیلا'۔ 'لے سویٹ سونگ'، 'دوسرے ملک کا آدمی'۔ 'کمپوزیشن نمبر ایک'، 'بلا عنوان'، 'پورٹریٹ نمبر تین' ـــــ نام کی پینٹنگز کے سامنے رک رک کر ہم نے ان کے بارے میں گفتگو کی۔ ان میں سے بیشتر تصاویر مجھے رنگوں کے انتخاب اور گہری خیال آرائی کی وجہ سے ہی پسند آئیں۔ میں نے ان کی دل کھول کر تعریف کی۔

"ان میں آپ کے دل و دماغ کی کتنی ہی مختلف کیفیتیں موجود ہیں۔ کہیں کہیں تو آپ حد درجہ اداس نظر آتی ہیں کہیں کہیں بہت ہی مسرور۔ کسی جگہ کسی کی منتظر اور کسی میں ہر چیز سے بیزار"!

یہ سن کر اس نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ دھیرے سے کانپتے ہوئے لہجے میں بولی ـــــ "نہیں نہیں ترون جی۔ ڈونٹ بی سو لاوڈ پلیز! اتنی زیادہ تعریف مت کیجیے۔!"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کہا ــــــ ”میں نے جو کچھ کہا ہے وہ سب جینوئن ہے!“

”آپ جانتے ہیں آرٹسٹ کی موت اسی قسم کی تعریف میں ہی ہوئی ہے!“

باتیں کرتے کرتے ہم ہال سے باہر آگئے۔ کلب ہاؤس اور لائبریری کے بیچ ایک تنگ سی گلی تھی جو نیچے جھیل کی طرف جاتی تھی۔

”بیلا جی، میں نے آپ کے آرٹ میں آج پہلی بار کرب محسوس کیا۔ ایک عجیب سی بے قراری بھی جو آپ کے لیے کبھی بھی بڑی سے بڑی تخلیق کا سرچشمہ ہو تو ہو اس میں میرے لیے بھی ایک اپنا پن موجود ہے۔ جیسے یہ سب خود مجھ پر ہی بیت رہا ہو!“

”جو کچھ آرٹسٹ پر بیتتی ہے وہ کسی دوسرے پر ہرگز نہیں بیتتی!“

”پکاسو نے ایک بار کہا تھا ــــــ“

”پکاسو کی بات رہنے دیجیے۔ جو میں کہتی ہوں اُسے سنیے۔ ایبسٹریکٹ آرٹ کی حدود یہیں سے شروع ہوتی ہیں۔ جہاں تماشائی خود اپنی اندرونی اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اپنے ری ایکشنز کا شکار!“

”میرا سب سے بڑا ری ایکشن یہ ہے کہ میں ــــــ“

میری قوّت گویائی جواب دے گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کے بہت قریب۔ وہاں اتنی روشنی نہیں تھی کہ ایک دوسرے کو صاف صاف دیکھ سکتے لیکن مجھے اُس کی آنکھوں کی چمک واضح طور پر نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھیں مجھ پہ ہی گڑی تھیں۔ میرے دل و دماغ کو چھیڑے دے رہی تھیں۔ میں نے اسے اپنے قریب کر لیا تو وہ میرے بازوؤں میں بے اختیار سمٹی چلی آئی۔ پہلے میں نے اُسے بوسہ دیا۔

دوسری بار اُس نے ایسا کیا۔ تیسری بار میں نے پھر اسی عمل کو دُہرانا چاہا تو وہ مجھ سے دور ہٹ گئی۔

"نہیں نہیں مسٹر ترہ دن! میرے اتنے قریب مت آییے۔ پلیز! آپ نہیں جانتے میں گنگولی کو کتنا چاہتی ہوں۔!"

"میں کچھ دیر بوٹنگ کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میرا ساتھ نہیں دے سکتیں؟"

اس نے انکار کر دیا۔ "نہیں مسٹر ترون۔ مجھے نمائش میں رہنا ہے۔ گنگولی کا انتظار کرنا ہے۔ وہ آتا ہی ہوگا۔"

وہ جلدی سے پلٹ گئی۔ میں اکیلا ہی بوٹنگ کرنے چلا گیا۔ جھکی ہوئی سیاہ رات کے نیچے خاموش جھیل کے وسیع سینے پر ایک بچے کی طرح ہاتھ چلا چلا کر دھیرے دھیرے حرکت کرتا پھرا۔ لگتا تھا یہ ساری ہی جھیل بیلا کا دل ہے۔ بظاہر پُرسکون۔ لیکن اندر سے بے چین! بہت ہی بے چین۔ میری وجہ سے جو لہریں پیدا ہو رہی تھیں وہ فوراً مٹ بھی جاتی تھیں۔

میں نینی تال میں چند روز اور رہا۔ شام کو مال روڈ پر ٹہلنے نکلتا تو چند منٹ کے لیے کلب ہاؤس میں ضرور جاتا۔ بیلا سے ہی ملنے۔ وہ بھی مجھ سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتی۔ لیکن ایک فاصلے سے۔ اس نے پھر مجھے کبھی قریب نہ ہونے دیا۔ اس کے جس قرب کی وجہ سے میرا بدن ابھی تک سرشار تھا وہ چند لمحوں کا ہی جادو تھا۔ وہ تو اُن لمحات کی جکڑ بند سے اسی وقت آزاد ہو گئی تھی۔ میں ابھی تک ان کا قیدی تھا۔

ایک دن اس نے مجھے فلیٹس پر ایک ہوٹل میں رات کے کھانے پر بُلایا۔ وہاں گنگولی بھی موجود تھا اور ایک لڑکی امبا نام کی بھی۔ جیسے میں

نے بہت ہی خوب صورت پایا۔ آرٹسٹوں اور فوٹو گرافروں کے ساتھ رہتے رہتے ہر لڑکی میں جسمانی کشش ڈھونڈنا میری عادت بن چکی تھی۔ ہر خوب صورت عورت کے اندر ایک ماڈل کی تلاش کرنے لگتا تھا۔

امبا بیلا کی چھوٹی بہن تھی وہیں کونونٹ میں ٹیچر تھی۔ اُسے دیکھتے ہی میں نے بیلا سے کہہ دیا ـــــ "یہ لڑکی آپ کا ماڈل بننے کے قابل ہے! اب کچھ مدّت تک انھیں کو پینٹ کیجیے۔"

یہ سُن کر بیلا مسکرا دی اور اپنی بہن کی طرف بڑی تیکھی نظر سے دیکھا۔

وہ رات بہت ہی خوش گوار تھی۔ گنگولی اور میں نے ڈنر سے پہلے کافی مقدار میں بیئر پی لی۔ بیلا نے بھی کچھ ساتھ دیا۔ لیکن امبا اس شغل سے دور ہی رہی۔ جب ہم اسکیٹنگ رِنگ میں گئے تو وہاں اس نے بہت کمال دکھایا۔ فلور پر ناچنے والے لڑکوں اور لڑکیوں میں وہی سب سے تیز اور ماہر نکلی۔ بیلا کو اور مجھے تو اسکیٹنگ آتی ہی نہیں تھی۔ گنگولی ہی امبا کا پارٹنر بنا رہا۔ ہم تماشائی ریلنگ پر جھکے انھیں بار بار چیئرز دیتے رہے۔

اس کے بعد میں دو بار بیلا سے ملنے کے لیے گیا۔ وہ تو ملی، لیکن امبا کہیں دکھائی نہ دی۔ دونوں ہی بار وہ گنگولی کے ساتھ کہیں گئی ہوئی تھی۔ جب میں نے بیلا کو اپنے لوٹنے کے پروگرام سے مطلع کیا تو اس نے کہا ـــــ "ہم لوگ ایک بار پھر لکھنؤ دیکھنا چاہتے ہیں۔ سُنا ہے وہاں کی بارشیں بہت ہی پُرلطف ہوتی ہیں!"

میں نے بہت خوش ہو کر اُسے لکھنؤ آنے کی دعوت دے دی۔ بیلا اگست کے آخری ہفتہ میں ہی لکھنؤ آ سکی۔ ساتھ گنگولی

اور امبا کو بھی لے کر آئی تھی۔ امبا کی آمد غیر متوقع تھی۔ اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ وہ اپنی بہن سے بہت مختلف تھی۔ آرٹ لٹریچر وغیرہ بیماریوں سے بالکل بچی ہوئی۔ اس کی دل چسپی کا مرکز خود اس کی اپنی ذات تھی۔ اپنی ہی خوبصورتی اور دل کشی۔ میرے دل و دماغ نے اس کا اثر بھی قبول کیا۔ میں ایک ایسی عورت کو قبول کر سکتا تھا جو اپنی خوب صورتی کے علاوہ بھلے ہی اور کچھ نہ ہو لیکن وہ امبا ضرور ہو۔ پتہ نہیں اس نے پڑھانے کا پیشہ کیوں اختیار کر لیا ہے۔ یہ اس کے لیے فطری ہرگز نہیں ہے۔ میں رہ رہ کر سوچتا تھا۔

میری تجویز پر بیلا نے امبا کے کچھ پورٹریٹ بنائے تھے۔ کچھ نیوڈ تھے۔ لگتا تھا بیلا نے امبا کو اپنی نظر سے نہیں میری نظر سے دیکھ دیکھ کر پینٹ کیا تھا۔

میں نے انھیں ایک پورے چاند کی رات کو کوالٹی کے اوپن ایر ریسٹوراں میں کھانے پر بُلایا۔ یہ ریسٹوران ایک پبلک پارک میں ہے۔ رات کو مون لائٹ میں یہاں وہاں مختلف ٹولیوں کی شکل میں بیٹھ کر ڈنر کھانا اور باتیں کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔ لیکن اس دن سرِشام ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ہمیں مجبوراً ریسٹوراں کی عمارت کے اندر ہی بند ہو کر بیٹھنا پڑ گیا۔ لیکن اندر بیٹھنا بھی کم دل چسپ ثابت نہ ہوا۔ تندوری مُرغ، فرج کیے ہوئے دسہری آم اور دوسرے لذیذ ترین لوازمات کے علاوہ میرے لیے سب سے پُر لطف چیز امبا کا ساتھ تھا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ اپنی باتوں میں اس قدر کھو گئے کہ بیلا اور گنگولی کو قریب قریب نظرانداز ہی کر دیا۔

ہماری باتوں کا موضوع پڑھانے کا پیشہ تھا۔ مجھے اب تک اس کے بارے میں بڑی غلط فہمی رہی تھی۔ وہ خوب صورت ہونے کے علاوہ بھی

بہت کچھ تھی۔ وہ بچوں کے فطری رجحانات سے بخوبی واقف تھی۔ پڑھانا بھی اس کے لیے ایک قدرتی خوبی تھی۔ اس موضوع پر وہ کئی آرٹیکل لکھ چکی تھی۔ جو تعلیمی اور لیڈیز جرنلز میں شائع ہو چکے تھے۔ اب دونوں بہنیں غیر ممالک کے ٹور کے لیے روپیہ جمع کر رہی تھیں۔ میں نے اس انکشاف کی تصدیق کے لیے بیلا کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دی۔ اُسی وقت میری نظر گنگولی کی طرف اُٹھ گئی جو ایک بوٹی پر کا گوشت لمبے لمبے دانتوں سے بڑی بے رحمی سے نوچ نوچ کر کھا رہا تھا۔ اس کی داڑھی پر گوشت کے دو ذرّے سے اٹکے ہوئے تھے۔

کھانا ختم کر چکنے کے بعد ہم پے انگ گیسٹ ہاؤس گئے۔ جہاں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس وقت بھی موسلا دھار مینھ برس رہا تھا۔ امبا اور میں ایک ہی اسکوٹر ٹیکسی میں بیٹھے۔ اُسے میں نے اپنا رین کوٹ بھی اُوڑھا دیا اور اس کے گرد اپنا ایک بازو بھی اس طرح پھیلا دیا جیسے اب اُسے ہر بلا سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ اس وقت وہ بڑی سنجیدگی سے میرے جرنلزم کے کیریئر کے متعلق سوالات پوچھ رہی تھی۔

جب ہم گیسٹ ہاؤس میں پہنچے اس وقت تک بیلا اور گنگولی وہاں پہنچ چکے تھے اور برآمدے میں کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ گنگولی کی آنکھوں میں بڑی ترشی اور حسد کی جھلک تھی۔ بیلا چپ تھی۔ بس چپ۔ لیکن میں وہاں سے بڑی مسرور کیفیت کے ساتھ لوٹا۔

دوسرے دن شام کو میں پھر گیسٹ ہاؤس گیا۔ میں چاہتا تھا اب امبا کے قریب ہی رہوں۔ اُسے اپنے لیے محفوظ کر لوں۔ مجھے یقین تھا میں ناکام نہیں رہوں گا۔ یہ میری خوش فہمی نہیں تھی۔ امبا مجھے پسند کر چکی

تھی۔ لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا امبا تو اسپتال میں داخل ہو چکی ہے۔ بیلا صبح ہی سے اس کے ساتھ ہے۔

اسپتال گیا تو وہاں ایک پرائیویٹ کاٹیج میں امبا کو سکتے کی کیفیت میں پایا۔ چھت کی طرف ایک ٹک گھورتے ہوئے۔ موت کی طرح زرد اور کمزور۔ جیسے کسی نے اس کا سارا ہی خون نچوڑ لیا ہو۔ بیلا اُس کے پاس ایک آرام کُرسی میں دُبکی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ گھٹنوں پر اسکیچ بُک پھیلائے، اس پر مسلسل پنسل چلا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ روہانسی سی ہو گئی بولی ـــــ "امبا کے ساتھ کوئی بات نہ کیجیے گا۔ باہر چلیے سب کچھ بتاتی ہوں۔"

اس نے برآمدے میں لے جا کر مجھے بتایا ـــــ "کل رات گنگولی نے بڑی کمینگی دکھائی۔ ہمارے زیور، کپڑے، روپے وغیرہ سب کچھ چھین کر بھاگ گیا۔ ہمیں مارا بھی۔ امبا کا تو گلا دبانے کی بھی کوشش کی۔ اسی وجہ سے امبا کی یہ حالت ہو گئی ہے۔"

میں نے گنگولی کو کبھی اچھا آدمی نہیں سمجھا تھا۔ وہ مجھے کسی بھی پہلو سے آرٹسٹ معلوم نہیں ہوا تھا۔ اس کی پوری شخصیت ہی مجھے بناوٹ ہی بناوٹ نظر آتی تھی۔

بیلا کو چھوڑ کر میں پھر امبا کے پاس گیا۔ وہ اُسی طرح چھت کو گھور رہی تھی۔ مجھ سے اس کی یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا ـــــ "امبا، میری بات سُنو۔"

اس نے آنکھیں تک نہ جھپکیں۔ میری طرف سر بھی نہ گھمایا۔ میں نے خود ہی اس کا چہرہ اپنی طرف گھما لیا تب بھی اس نے میرے ساتھ نظر نہ

ملائی ۔ میرے کندھوں سے اوپر ہی اوپر دیکھتی رہی ۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے پریشان بالوں کو ایک طرف کیا۔ اس کے ماتھے کو چھوا۔ گالوں کو سہلایا۔ اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر انگلیوں میں انگلیاں پھنسائیں اُسے یہ یقین دلانے کے لیے کہ میں اس کے پاس ہوں۔ اس کے ساتھ ہوں۔ لیکن وہ چپ رہی ۔ چپ اور اڈول ۔

اس بیچ میں بیلا کمرے میں آ کر پھر سے آرام کرسی پر بیٹھ گئی تھی اُسی کاپی میں کچھ اسکیچ بناتی رہی تھی ۔ امبا کے پاس سے اٹھ کر میں اس کے پاس گیا اس کی کاپی لے کر اسکیچ دیکھنے لگا۔ ان میں اس کی اپنی ہی پریشانی نظر آئی۔ آڑی ترچھی اور اُلجھی اُلجھی بے شمار لکیریں تھیں۔ کوئی تصویر واضح نہیں تھی ۔ کوئی نقش مکمل نہیں تھا۔ کوئی چہرہ اُبھرتا تھا تو اس پر کتنی ہی دوسری لکیریں ٹوٹ ٹوٹ پڑتی تھیں۔

اچانک بیلا نے میرے ہاتھ سے اسکیچ بک لے لی۔ بولی ”آپ میرا ماڈل بننا پسند کریں گے ؟“

”میں ؟ ——“ میں نے حیران ہو کر ہلکا سا قہقہہ بھی لگا دیا۔

بولی —— ”ہاں آپ۔ آپ میرا ماڈل بنیں تو میں آپ کا اسکیچ بنا دوں ۔“

مجھے یوں لگا اس کا دماغ چل گیا ہے ۔ اس خوف سے کانپ بھی گیا۔

اس نے مجھے اپنے سامنے کھڑا رہنے کے لیے کہا۔ کچھ لمحوں تک مجھے گھورتی رہی۔ میں اپنی جگہ سے ہٹ کر اس کے پاس گیا اس کے دونوں پہلوؤں پر ہاتھ رکھ کر کہا ——

”آپ کو کیا ہو گیا، بیلا جی ! ہوش میں آئیے ۔“

اس نے میرے ہاتھ ہٹا دیئے۔ کہا ــــــ" آپ ہی نے ایک بار کہا تھا میں مردوں کو اپنا ماڈل کیوں نہیں بناتی؟ اب آپ میرے ساتھ کوآپریٹ کیجیے۔ ہو سکتا ہے مجھے اس طرح زیادہ شہرت مل جائے۔"

میں چپ، حیران سا کھڑا رہ گیا۔ اسے کیسے سمجھاؤں؟ امبا کی طرف دیکھا لیکن وہ تو ہم دونوں سے ہی بے خبر لیٹی تھی۔

بیلا میری قمیص کے کف کھول کر آستینیں اوپر کو الٹنے لگی۔ بولی ـــــ" میں پہلی بار ایک مرد کی طاقت کا پورٹریٹ بناؤں گی۔ لیکن آپ اس قدر گھبرا کیوں رہے ہیں؟ آپ تو بہت مضبوط اور رومانٹک تھے! یاد ہے، ایک دن آپ نے مجھے اپنے بازوؤں میں کتنے زور سے باندھ لیا تھا! آپ کی محبت کی وہ شدت اور شوخی کیا ہوئی؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں حسد کی ایک گہری جھلک دیکھی جیسے اسے میرا امبا کے نزدیک ہونا قطعی پسند نہ ہو۔ وہ امبا کے سامنے مجھے ذلیل کرنا چاہتی ہے۔ میں نے اس سے کہا" مجھے معلوم نہ تھا آپ اتنا گر جائیں گی! آپ جانتی ہیں امبا کو کس قدر چاہتا ہوں۔"

وہ میری بات پر ہنس دی۔ بولی ــــــ ڈونٹ مس انڈراسٹینڈ می! مجھے غلط کیوں سمجھ رہے ہیں؟ میں آپ کے جسم کی دل کشی کو بہت اچھی طرح پینٹ کروں گی۔ آپ کپڑے اتار ڈالیے یقین کیجیے اس میں مجھے کوئی گھبراہٹ نہیں ہوگی۔"

اس نے میری قمیص اتارنے کی کوشش کی۔ مجھے اس کی ضد بہت عجیب سی لگی۔

"میں آپ کا چہرہ نہیں دکھاؤں گی۔ آئی پرامز!"

جب میں نے کپڑے اُتارے تو مجھے اپنے بدن کے بھدے پن کا پہلی بار پتہ لگا۔ اپنے گھنے بالوں سے بھرے ہوئے جسم کو میں نے پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا لیکن اس وقت وہی مجھے اپنا معلوم نہ ہوا۔ میرے اندر پہلے ایسی لاچاری، بے ہمتی اور خوف کی کیفیت کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جتنی اب ہو رہی تھی۔

بیلا نے مجھے امبا کے پلنگ کے پاس کھڑا کر دیا۔ اس پر ذرا جھک کر کھڑا ہونے کے لیے کہا اور دونو بازو پھیلا کر۔ خود کرسی پر جا بیٹھی۔ کاپی پر پنسل چلانے لگی۔

میری نظریں امبا پر جا ٹکیں۔ جو میرے سامنے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اسی طرح چھت پر نظریں جمائے ہوئے۔ جتنی دیر تک بیلا میرا اسکیچ بناتی رہی۔ میں امبا پر ہی جھکا ہوا اُسے دیکھتا رہا۔ اچانک امبا کے جسم میں حرکت پیدا ہونے لگی۔ اس نے چھت پر سے نظریں ہٹا لیں۔ وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ کچھ حیرانی سے، کچھ خوف سے۔ پھر خوف ہی اس پر غالب آ گیا چیخ کر اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔

میں وہاں سے ہٹ گیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ سارا بدن پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے۔ بیلا بھی اسکیچ بک کرسی پر پھینک کر امبا کے پاس جا بیٹھی۔ مجھے بیلا پر بہت غصہ آیا۔ اس نے یہ کیا حرکت کی تھی۔

میں نے اس کا بنایا ہوا اسکیچ دیکھا۔ امبا پر جو شخص جھپٹنے کے انداز میں جھک کر کھڑا تھا اس کا سر نہیں تھا۔ صرف دھڑ ہی دھڑ تھا۔ لیکن اس دھڑ میں بھی ایک زندہ، مضبوط اور جابر شخص کی ساری حرکت موجود تھی۔ ساری

موومنٹ، جو خون کی گردش اور جسم کی جملہ خواہشات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ سر نہ ہونے کی وجہ سے وہ فگر بہت ہی بھیانک معلوم ہوئی۔ میں نے تصویر ایک طرف پھینک دی۔ کہا ــــ " آپ نے مجھے اس طرح کیوں دکھایا ؟ ریپ میں نے کیا تھا یا گنگولی نے ؟"

"کیا فرق پڑتا ہے!" بیلا نے روتی سسکتی ہوئی بہن کا سر اپنی گود میں لے لیا۔" یہ حرکت ایک مرد ہی تو کر سکتا ہے۔ طاقت ور اور دلکش مرد !"

اس نے آنسو چھپانے کے لیے اپنا چہرہ اما کے گھنے بالوں میں ڈبو لیا۔

کتبہ: نسیم احمد
اکتوبر ۱۹۶۶ء دہلی

برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں

مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب
کے حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ
کو جوائن کریں

ایڈمن پینل :

محمد ثاقب ریاض : 03447227224

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

Imagitor

شاہ ولی اللہ اوران کا خاندان

تالیف : محمود احمد برکاتی

صفحات : 152

قیمت : -/63 روپے

سرسید سے اکبر تک

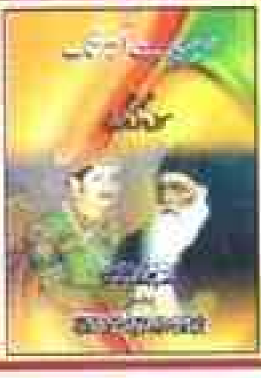

مرتبین : شمیم حنفی

سہیل احمد فاروقی

صفحات : 192

قیمت : -/72 روپے

پطرس کے مضامین

مصنف : احمد شاہ بخاری

صفحات : 156

قیمت : -/54 روپے

نیا اُردو نصاب

مرتبہ : محمد ذاکر

صفحات : 88

قیمت : -/48 روپے

موازنۂ انیس و دبیر

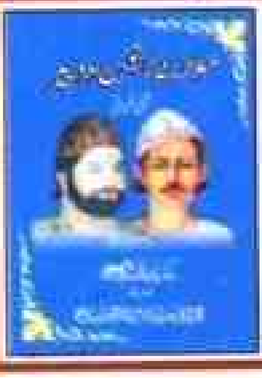

مصنف : شبلی نعمانی

صفحات : 304

قیمت : -/81 روپے

منجملہ

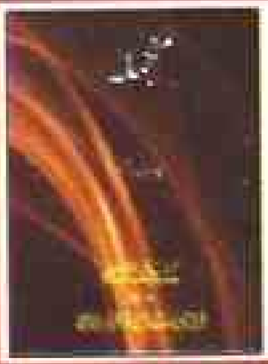

مصنف : یوسف ناظم

صفحات : 96

قیمت : -/50 روپے

مفکرین تعلیم

مصنف : محمد اکرام خاں

صفحات : 184

قیمت : -/72 روپے

مذہب اور جدید ذہن

مصنف : مشیر الحق

صفحات : 120

قیمت : -/56 روپے

ISBN: 978-81-7587-993-5

₹ 93/-